بسم اللہ الرحمن الرحیم

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کا سہ ماہی علمی و فکری مجلہ

الشریعہ
گوجرانوالہ

جلد : ۹
شمارہ : ۳
جولائی ۱۹۹۸ء

دینی مدارس کا نصاب تعلیم

زیر سرپرستی

مولانا محمد سرفراز خان صفدر

مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتی

رئیس التحریر

ابو عمار زاہد الراشدی

مدیر

حافظ محمد عمار خان ناصر

مدیر معاون

ناصر الدین خان عامر

قیمت فی پرچہ ۲۵ روپے، سالانہ ۱۰۰ روپے

بیرونی ممالک: سالانہ پندرہ امریکی ڈالر

ترسیل زر کے لیے

"الشریعہ" اکاؤنٹ نمبر ۳۶۰

حبیب بینک لمیٹڈ، بازار تھانے والا گوجرانوالہ

مینیجر "الشریعہ" جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ

ناشر: حافظ عبد المتین خان زاہد

طابع: مسعود اختر پرنٹرز، میکلوڈ روڈ لاہور

کمپوزنگ: الشریعہ کمپوزرز گوجرانوالہ

خط و کتابت کیلئے

الشریعہ اکادمی مرکزی جامع مسجد (پوسٹ بکس ۳۳۱) گوجرانوالہ۔ فون ۲۱۹۶۶۳-۰۴۳۱

E-Mail : afayaz@paknet1.ptc.pk

فہرست مضامین

کلمہ حق	مدیر اعلیٰ	۳
نصاب تعلیم کا مرحلہ وار جائزہ	ڈاکٹر رشید احمد جالندھری	۱۰
دینی مدارس اور ان کا نصاب	مولانا سید محمد رابع ندوی	۳۴
دینی تعلیم کی درس گاہیں	معتز امجد	۴۵
دینی مدارس کے نصاب کی اصلاح	ابو ہشام ریاض اسماعیل	۵۶
دینی مدارس میں معیار تعلیم کا مسئلہ	مولانا محمد عیسیٰ منصوری	۷۲
دینی مدارس کے حوالے سے قومی تعلیمی کمیشن کا سوال نامہ		۷۶
درس نظامی کا سرکاری نصاب		۸۶
نئی قومی تعلیمی پالیسی پر ایک نظر	ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی	۹۳
محترم حکیم محمد سعید صاحب کا مکتوب گرامی		۹۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلمہ حق

نئے دور کا چیلنج اور دینی مدارس

دینی مدارس کے موجودہ نظام کی بنیاد امداد باہمی اور عوامی تعاون کے ایک مسلسل عمل پر ہے جس کا آغاز ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد اس جذبہ کے ساتھ ہوا تھا کہ ۱۸۵۷ء کے معرکہ حریت کو مکمل طور پر کچل کر فتح کی سرمستی سے دوچار ہوجانے والی فرنگی حکومت سیاسی، ثقافتی، نظریاتی اور تعلیمی محاذوں پر جو یلغار کرنے والی ہے، اس سے مسلمانوں کے ایمان وعقیدہ اور تہذیب وتعلیم کو بچانے کی کوئی اجتماعی صورت نکالی جائے۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے دیوبند میں مدرسہ عربیہ (دارالعلوم دیوبند) سہارنپور میں مظاہرالعلوم اور مراد آباد میں مدرسہ شاہی کا آغاز ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت کے طول وعرض میں ان مدارس کا جال بچھ گیا۔ ان مدارس کے لیے بنیادی اصول کے طور پر یہ بات طے کر لی گئی کہ ان کا نظام کسی قسم کی سرکاری یا نیم سرکاری امداد کے بغیر عام مسلمانوں کے چندہ کی بنیاد پر چلایا جائے گا اور تاریخ گواہ ہے کہ انتہائی سادگی اور قناعت کے ساتھ ان مدارس نے برصغیر کے مسلمانوں کی وقیع دینی وعلمی خدمات سرانجام دیں۔

ان مدارس کے منتظمین اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد ایسے مردان باصفا کی تھی جو وقت کی رفتار کے ساتھ چلنے کا ارادہ کر لیتے تو دنیاوی زندگی کی سہولتیں اور آسائشیں بے دام غلام کی طرح ان کے دروازے پر قطار باندھے کھڑی نظر آتیں لیکن غیور اور جسور فقراء کے اس گروہ نے مسلمان کو مسلمان باقی رکھنے کے عظیم مشن کی خاطر نہ صرف ان آسائشوں اور سہولتوں کو تج دیا بلکہ اپنی ذاتی انا اور عزت نفس کی پروا نہ کرتے ہوئے صدقات، زکوٰۃ، عشر اور ایک ایک دروازے سے ایک ایک روٹی مانگنے کے لیے ہتھیلیاں اور جھولیاں قوم کے سامنے پھیلا دیں اور ہر قسم کے طعن وتشنیع اور تمسخر واستہزاء کا خندہ پیشانی کے ساتھ سامنا کرتے ہوئے انتہائی صبر وثبات کے ساتھ ایک ایسے نظام تعلیم کی بنیاد رکھ دی جس نے برصغیر میں سپین کی تاریخ دہرانے کی فرنگی خواہش اور سازش کا تار وپود بکھیر کر رکھ دیا اور برطانوی حکمران بالآخر یہی حسرت دل میں لیے ۱۹۴۷ء میں یہاں سے بوریا بستر سمیٹنے پر مجبور ہو

گئے۔

دینی مدارس کی جدوجہد کے نتائج و ثمرات کے حوالہ سے اگر معاشرے میں ان مدارس کے اجتماعی کردار کا تجزیہ کیا جائے تو تمام تر خامیوں، کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود اس کی شکل کچھ اس طرح سامنے آتی ہے کہ:

○ لارڈ میکالے نے مسلمانوں کی نئی نسل کو ذہنی لحاظ سے انگریز کا غلام بنانے اور نو آبادیاتی فرنگی نظام کے کل پرزوں کی شکل میں ڈھالنے کے لیے جس نظام تعلیم کی بنیاد رکھی تھی، اس کے مقابلے میں دینی مدارس کی شکل میں ایک مستحکم اور ناقابل شکست متوازی نظام تعلیم اور مغربی ثقافت سے محفوظ رہنے کی خواہش رکھنے والے غیور مسلمانوں کو ایک مضبوط نظریاتی اور تہذیبی حصار میسر آگیا۔

○ جدید عقل پرستی کی بنیاد پر دینی عقائد وروایات سے انحراف، انکار ختم نبوت، انکار حدیث اور اس قسم کے دیگر اعتقادی اور مذہبی فتنوں نے سر اٹھایا تو یہ دینی مدارس پوری قوت کے ساتھ ان کے سامنے صف آرا ہو گئے اور ملت اسلامیہ کی راسخ الاعتقادی کا تحفظ کیا۔

○ فرنگی تہذیب اور یورپی ثقافت کی طوفانی یلغار کا سامنا کرتے ہوئے دینی مسلم ثقافت کو ایک حد تک بچانے اور بطور نمونہ باقی رکھنے میں ان مدارس نے کامیابی حاصل کی۔

○ قرآن و سنت کے علوم، عربی زبان اور دینی لٹریچر کو نہ صرف زمانہ کی دست برد سے بچا کر رکھا بلکہ ملک میں ان علوم کے حاملین اور مستفیدین کی ایک بڑی تعداد پیدا کر کے اگلی نسلوں تک انہیں من وعن پہنچانے کا اہتمام کیا۔

○ دینی مدارس کے اس نظام نے تحریک آزادی کو شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا عبد القیوم پوپلزئیؒ، مولانا تاج محمود امروٹیؒ، مولانا خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ، مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ، مولانا عبد القادر قصوریؒ، اور صاحبزادہ سید فیض الحسنؒ اور تحریک پاکستان کو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا اطہر علیؒ، مولانا عبد الحامد بدایونیؒ اور مولانا محمد ابراہیم میرؒ سیالکوٹی جیسے بے باک، مخلص اور جری راہنماؤں کی صورت میں ایک مضبوط نظریاتی قیادت مہیا کی جن کے ایثار، قربانی اور جدوجہد نے تحریک آزادی اور تحریک پاکستان کو کامیابی کی منزل سے ہمکنار کیا۔

○ افغانستان کی سنگلاخ وادیوں میں کمیونزم کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کا جائزہ لے لیا جائے جس نے روسی افواج کو افغانستان سے نکلنے پر مجبور کرنے کے علاوہ وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں کو آزادی سے ہمکنار کیا اور روسی استعمار کے آہنی پنجے کو توڑ کر مشرقی یورپ کو بھی کمیونزم کی گرفت سے آزاد کر دیا ہے۔ افغانستان کے غیور مسلمانوں کے اس عظیم جہاد کی قیادت کا ایک بڑا اور فیصلہ کن حصہ انہی دینی مدارس کا تربیت یافتہ ہے۔ اس طرح افغانستان کو روسی کمیونزم کے لیے "پانی پت" کا میدان بنا دینے کا کریڈٹ بھی دینی مدارس کے اسی نظام کے حصہ میں آتا ہے۔ اور اب جہاد افغانستان کے ثمرات کو سبوتاژ کرنے کی عالمی سازش کو ناکام بنا کر ایک نظریاتی اسلامی حکومت قائم کرنے والے "طالبان" تو سو فی صد انہی مدارس کے فیض یافتہ اور انہی اکابر کے خوشہ چین ہیں۔

الغرض دینی مدارس کی یہ عظیم جدوجہد اور اس کے نتائج و ثمرات تاریخ کے صفحات پر اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ کوئی ذی شعور اور منصف مزاج شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا اور یہ حقیقت ہے کہ فرنگی اقتدار کے تسلط، مغربی تہذیب وثقافت کی یلغار اور صلیبی عقائد وتعلیم کی بالجبر ترویج کے دور میں یہ مدارس ملی غیرت اور دینی حمیت کا عنوان بن کر سامنے آئے اور انہوں نے انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں سیاست، تعلیم، معاشرت، عقائد اور تہذیب وثقافت کے محاذوں پر فرنگی سازشوں کا جرات مندانہ مقابلہ کر کے برصغیر پاک وہند وبنگلہ دیش کو سپین بننے سے بچا لیا اور یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آج اس خطہ زمین میں مذہب کے ساتھ وابستگی اور اسلام کے ساتھ وفاداری کے جن مظاہر نے کفر کی پوری دنیا کو لرزہ براندام کر رکھا ہے، عالم اسباب میں اس کا باعث صرف اور صرف یہ دینی مدارس ہیں لیکن مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تصویر کے دوسرے رخ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے اور ارباب فہم ودانش کی ان توقعات اور امیدوں کا مرثیہ بھی پڑھ لیا جائے جن کا خون ناحق ہمارے دینی مدارس کی اجتماعی قیادت کی گردن پر ہے۔

تفصیلات وفروعات تک گفتگو کا دائرہ وسیع کرنے کی بجائے ہم اپنی گزارشات کو صرف دو سوالات کے حوالے سے قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۱) جدید مغربی فلسفہ حیات کے اثرات سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمارے دینی مدارس کا کردار کیا ہے؟ اور

(۲) مسلم معاشرے میں نفاذ اسلام کے ناگزیر علمی وفکری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ان مدارس کا نظام کار اور حکمت عملی کیا ہے؟

ایک دور تھا جب یونانی فلسفہ نے عالم اسلام پر یلغار کی تھی اور عقائد وافکار کی دنیا میں بحث و تمحیص کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اگر اس وقت عالم اسلام کے تعلیمی مراکز اور اہل علم یونانی فلسفہ کی اس یلغار کو وقتی طوفان سمجھ کر نظر انداز کر دیتے اور اپنے کان اور منہ لپیٹ کر اس کے گزر جانے کا انتظار کرتے رہتے تو اسلامی علوم وعقائد کا پورا ڈھانچہ فلسفہ یونان کی حشر سامانیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ لیکن علماء اسلام نے اس دور میں ایسا نہیں کیا بلکہ یونانی فلسفہ کے اس چیلنج کو قبول کر کے خود اس کی زبان میں اسلامی عقائد وافکار کو اس انداز سے پیش کیا کہ یونانی فلسفہ کے لیے پسپائی کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا اور اس کے بپا کیے ہوئے فکری اور نظریاتی معرکوں کے تذکرے آج رازیؒ ، غزالیؒ ، ابن رشدؒ اور ابن تیمیہؒ کی تصنیفات میں یادگار کے طور پر باقی رہ گئے ہیں۔

یورپ کے جدید فلسفہ حیات کی یلغار بھی یونانی فلسفہ کے حملہ سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ یہ فلسفہ حیات جس نے انقلاب فرانس کے ساتھ اپنا وجود تسلیم کرایا اور پھر یورپ کے صنعتی انقلاب کے زیر سایہ اپنا دائرہ وسیع کرتے ہوئے آج دنیا کے اکثر وبیشتر حصہ کو لپیٹ میں لے چکا ہے، خود کو انسانی زندگی کے ایک ہمہ گیر فلسفہ کے طور پر پیش کرتا ہے اور انسان کی پیدائش کے مقصد سے لے کر انسانی معاشرت کے تقاضوں اور مابعد الطبیعات کی وسعتوں تک کو زیر بحث لاتا ہے۔ ڈارون، فرائیڈ، نطشے اور دیگر مغربی فلاسفروں اور سائنس دانوں کی گزشتہ دو صدیوں پر محیط فکری کاوشوں اور نظریاتی مباحث کا خلاصہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ کلیسا کی بدکرداریوں اور مظالم کے رد عمل کے طور پر جنم لینے والے اس فلسفہ کو یورپ نے ایک مکمل فلسفہ حیات کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے ذریعہ وہ دنیا میں موجود اسلام سمیت تمام فلسفہ ہائے حیات کو مکمل شکست سے دوچار کر کے فنا کے گھاٹ اتارنے کے درپے ہے۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نے یورپ کی اس فکری یلغار کی ماہیت اور مقاصد کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور اسے محض اقتصادی اور سیاسی بالادستی کا جنون سمجھ کر اس انداز میں اس کا سامنا کرتے رہے اور اس کے فکری اور اعتقادی پہلوؤں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ یونانی فلسفہ کے در آنے سے ہمارے ہاں عقائد کے نئے مباحث چھڑ گئے تھے جنہیں علماء اسلام نے اپنے فکری اور علمی مباحث میں سمو دیا اور ہمارے عقائد کی بیشتر کتابیں ان مباحث سے بھرپور ہیں حتیٰ کہ دینی مدارس کے نصاب میں آج کے طلباء کو عقائد کے حوالے سے انہیں مباحث سے روشناس کرایا جاتا ہے جو یونانی فلسفہ کی پیداوار ہیں اور جن

میں سے زیادہ تر کا آج کے نئے فکری اور اعتقادی تقاضوں کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے لیکن جو اعتقادی مباحث یورپ کے فلسفہ حیات نے چھیڑے' نہ ہماری عقائد کی کتابوں میں ان کا کوئی ذکر ہے اور نہ ہم طلبہ کو ان مباحث کی ہوا ہی لگنے دیتے ہیں۔

ڈارون کا نظریہ ارتقاء' انسان کے مقصد وجود میں کشش جنسی کی محوری حیثیت کے بارے میں فرائیڈ کے تصورات' اجتماعی زندگی سے مذہب کی مکمل لاتعلقی اور غیر محدود فکری آزادی کا نعرہ آخر اعتقادی مباحث نہیں تو اور کیا ہیں؟ اور کیا انہیں افکار و نظریات کا شکار ہو کر مسلمان کہلانے والوں کی ایک بڑی تعداد اسلام کے اجتماعی کردار سے منکر یا کم از کم مذبذب نہیں ہو چکی ہے؟ اس اعتقادی فتنہ کی روک تھام کے لیے ہمارے دینی مدارس کا کیا کردار ہے؟ ہمارے نصاب میں تفسیر' حدیث' فقہ اور عقائد کی کون سی کتاب میں یہ مباحث شامل ہیں اور ہم اپنے طلبہ کو ان مباحث سے روشناس کرانے اور انہیں ان کے جواب کی خاطر تیار کرنے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟

یہ وقت کا ایک اہم سوال اور دینی مدارس کی اجتماعی قیادت پر مسلم معاشرہ اور نئی نسل کا ایک قرض ہے جس کا سامنا کیے بغیر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ فروعی اور جزوی مسائل ہمارے ہاں بنیادی اور کلیدی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور جو امور فکر واعتقاد کی دنیا میں بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں' ان کی ہماری نظر میں کوئی وقعت ہی باقی نہیں رہی۔ ہماری پسند وناپسند اور وابستگی ولاتعلقی کا معیار جزوی مسائل اور گروہی تعصبات ہیں۔ ایک مثال بظاہر معمولی سی ہے لیکن اس سے ہماری فکری ترجیحات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے' وہ یہ کہ ہمارے ایک دوست نے جنہوں نے ہمارے دینی ماحول سے تربیت حاصل کی ہے' گزشتہ دنوں ایک بڑے سیاسی لیڈر کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا کہ وہ بہت اچھا اور صحیح العقیدہ لیڈر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ایک بیان میں کہا ہے کہ میں برسیوں اور عرسوں میں شامل ہونے کا قائل نہیں ہوں۔ ان سے عرض کیا گیا کہ وہ سیاسی لیڈر تو سیکولر نظریات کا قائل ہے اور اجتماعی زندگی میں نفاذ اسلام کو ذہنی طور پر قبول نہیں کرتا۔ اس کے جواب میں ہمارے اس دوست کا کہنا یہ تھا کہ یہ تو سیاسی باتیں ہیں' اصل بات یہ ہے کہ وہ عرسوں اور برسیوں کا مخالف ہے اس لیے وہ ہمارے مسلک کا ہے اور صحیح العقیدہ ہے۔ یعنی اسلام کے اجتماعی زندگی میں نفاذ کا مسئلہ سیاسی ہے اور عرسوں میں شریک ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ اعتقادی ہے۔ آخر یہ سوچ کہاں سے آئی ہے؟ کیا یہ ہمارے دینی مدارس کی غلط فکری ترجیحات کا ثمرہ نہیں ہے؟

اب آیئے دوسرے نکتہ کی طرف کہ نفاذ اسلام کے علمی و فکری تقاضوں کی تکمیل کے لیے ہمارے دینی مدارس کا کردار کیا ہے؟

جہاں تک نفاذ اسلام کی اہمیت کا تعلق ہے' کوئی مسلمان اس سے انکار نہیں کر سکتا اور علماء اہل سنت نے اسے اہم ترین فرائض میں شمار کیا ہے بلکہ ابن حجر مکیؒ اور دیگر ائمہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ نظام اسلام کے نفاذ کے لیے خلافت کا قیام "اہم الواجبات" ہے جسے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جناب سرور کائنات ﷺ کی تدفین پر بھی ترجیح دی اور آنحضرت ﷺ کے جنازہ اور تدفین سے قبل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بطور خلیفہ انتخاب کیا۔

پھر برصغیر میں ہمارے اکابر کی جنگ آزادی کا بنیادی مقصد بھی حصول آزادی کے بعد نظام اسلام کا غلبہ و نفاذ رہا ہے اور پاکستان کا قیام بھی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے نعرہ پر شریعت اسلامیہ کی بالادستی کے لیے عمل میں آیا لیکن اسلام کو ایک اجتماعی نظام کے طور پر ہمارے دینی مدارس میں نہ پڑھایا جا رہا ہے اور نہ طلبہ کی اس انداز سے ذہن سازی ہی کی جا رہی ہے کہ وہ اسلام کا مطالعہ ایک نظام کے طور پر کریں حالانکہ حدیث اور فقہ کی بیشتر کتابیں محدثین اور فقہاء نے اس انداز سے لکھی ہیں کہ ان میں اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں کا الگ عنوان کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ عقائد' عبادات اور اخلاق کے علاوہ تجارت' خلافت' جہاد' دوسری اقوام سے تعلقات' صنعت' زمینداری' حدود و تعزیرات' نظام عمل' نظام عدالت' معاشرت اور دیگر اجتماعی شعبوں کے بارے میں حدیث اور فقہ کی کتابوں میں مفصل اور جامع ابواب موجود ہیں جن کے تحت محدثین اور فقہا نے احکام و ہدایات کا بیش بہا ذخیرہ جمع کر دیا ہے لیکن ان ابواب کی تعلیم میں ہمارے اساتذہ کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے اور ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ حدیث کی کتابوں میں ہمارے اساتذہ کے علم اور بیان کا سارا زور کتاب الطہارت اور صلوٰۃ کے جزوی مباحث میں صرف ہو جاتا ہے اور خلافت و امارت' تجارت و صنعت' جہاد' حدود' تعزیرات اور اجتماعی زندگی سے متعلق دیگر مباحث سے یوں کان لپیٹ کر گزر جاتے ہیں جیسے ان ابواب کا ہماری زندگی سے کوئی واسطہ نہ ہو یا جیسے ان ابواب کی احادیث اور فقہی جزئیات منسوخ ہو چکی ہوں اور اب صرف تبرک کے طور پر انہیں دیکھ لینا کافی ہو۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ اجتماعی زندگی سے متعلق ابواب کو زیادہ اہتمام سے پڑھایا جاتا۔ قانون' سیاست' خارجہ پالیسی' جنگ اور اجتماعیت کے افکار و نظریات سے اسلامی تعلیمات کا تقابل کر کے اسلامی احکام کی برتری طلباء کے ذہنوں میں بٹھائی جاتی اور

انہیں اسلامی افکار و نظریات کے دفاع اور اس کی عملی ترویج کے لیے تیار کیا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس اہم ترین دینی وقومی ضرورت سے مسلسل صرف نظر کیا جا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے علما کی پچانوے فیصد اکثریت خود اسلامی نظام سے ناواقف اور جدید افکار و نظریات کو سمجھنے اور اسلامی احکام کے ساتھ ان کا تقابل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کے اعتراف میں کسی حجاب سے کام نہیں لینا چاہیے اور اس کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی تلافی کی کوئی صورت نکالنی چاہیے۔

آج نفاذ اسلام کی راہ میں ایک بڑی عملی رکاوٹ یہ بھی ہے کہ اس نظام کو چلانے کے لیے رجال کار کا فقدان ہے۔ اسلامی نظام کو سمجھنے والے اور اسے چلانے کی صلاحیت سے بہرہ ور افراد کا تناسب ضرورت سے بہت کم ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اور یہ خلا آخر کس نے پر کرنا ہے؟ جس نظام تعلیم کو ہم لارڈ میکالے کا نظام تعلیم کہتے ہیں' اس سے تو یہ توقع ہی عبث ہے کہ وہ اسلامی نظام کے لیے کل پرزے فراہم کرے گا اور دینی نظام تعلیم اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کردار ادا نہیں کر رہا تو اسلامی نظام کے لیے رجال کار کیا آسمان سے اتریں گے؟

دینی مدارس کے اجتماعی کردار کے منفی پہلوؤں کے بارے میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش موجود ہے بلکہ بہت کچھ کہنے کی ضرورت ہے، لیکن ہم صرف مذکورہ دو اصولی مباحث کے حوالے سے توجہ دلاتے ہوئے تمام مکاتب فکر کے علماء کرام' دینی مدارس کی اجتماعی قیادت بالخصوص وفاق المدارس العربیہ' تنظیم المدارس اور وفاق المدارس السلفیہ کے ارباب حل وعقد سے گزارش کریں گے کہ وہ اس صورت حال کا سنجیدگی سے نوٹس لیں اور یورپ کے لادینی فلسفہ حیات کو فکری محاذ پر شکست دینے اور نفاذ اسلام کے لیے رجال کار کی فراہمی کے محاذ پر اپنے کردار کا ازسرنو تعین کریں ورنہ وہ اپنی موجودہ کارکردگی اور کردار کے حوالہ سے نہ خدا کی بارگاہ میں سرخرو ہو سکیں گے اور نہ مورخ کا قلم ہی ان کے اس منفی کردار کو بے نقاب کرنے میں کسی رعایت اور نرمی سے کام لے گا۔

ڈاکٹر رشید احمد جالندھری

دار العلوم دیوبند کا تاریخی پس منظر ---- اور

نصاب تعلیم کا مرحلہ وار جائزہ

برطانوی ہندوستان میں مسلم جماعت نے' اہل سنت ہوں یا اثنا عشری' اپنے مذہبی مدارس میں ایک حد تک ایک ہی نصاب تعلیم کو اپنایا' مثلاً سنی اور شیعہ مدارس میں عربی ادب' عربی گرامر (صرف ونحو) فلسفہ ومنطق کا نصاب تقریباً" ایک ہی تھا۔ البتہ حدیث اور اصول فقہ میں نصاب تعلیم ایک نہیں تھا۔ اثنا عشری مدارس میں حدیث کی وہ کتابیں پڑھائی جاتی تھیں' جن کی روایات براہ راست فاطمی ائمہ کرام سے روایت کی جاتی ہیں' البتہ سنی مدارس میں' خواہ ان کا تعلق بریلوی مکتب فکر سے ہو یا دیوبندی نقطہ نظر سے' دونوں جگہ حدیث سے متعلق کتابیں ایک ہی تھیں۔ مثلاً" صحاح ستہ (صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابو داؤد' سنن ابن ماجہ' نسائی اور صحیح ترمذی) یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ برطانوی ہندوستان میں مسلمانوں نے اپنی مذہبی روایات اور ملی تشخص کو بچانے کے لیے جو تعلیمی ادارے قائم کیے' ان میں سے ایک دار العلوم دیوبند بھی ہے۔ دیوبند کی اس مذہبی درس گاہ نے برصغیر میں مسلمانوں کی مذہبی اور اجتماعی زندگی میں ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے' جس سے تاریخ ہند کا کوئی سنجیدہ طالب علم تغافل نہیں برت سکتا' اور مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا کوئی تذکرہ خالی نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں۔

دار العلوم نے مسلمانوں کی مذہبی زندگی پر گہری چھاپ لگائی ہے' اس کا جائز تقاضا تھا کہ اہل تحقیق دار العلوم کو اپنا موضوع بناتے اور دیکھتے کہ دار العلوم نے کس حد تک مثبت یا منفی کردار ادا کیا ہے۔ یہ تنقیدی جائزہ خود دار العلوم کے لیے بھی بے حد سودمند ہوتا اور وہ اپنا محاسبہ کرنے کے بعد ایک نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھتا۔ افسوس کہ دار العلوم نے بھی کوئی ایسی کتاب مرتب نہیں کی جو تاریخ نویسی کے تقاضوں کو پورا کرتی ہو اور نقد وتبصرہ کے ان پیمانوں پر بھی پوری اترتی ہو جنہیں تاریخ نے حقائق کی چھان بین کے لیے وضع کر رکھا ہے' نیز یہ کہ وہ مسلمانوں کے نظام تعلیم یا ارتقاء اور انحطاط پر بھی بحث کرتی اور ان

اسباب کا سراغ لگاتی جنہوں نے مسلمانوں کو ان کی علمی بلندیوں سے اٹھا کر جہالت کی پستیوں میں پھینک دیا ہے۔ ضیاء الحسن فاروقی کی کتاب "دار العلوم" پہلی کامیاب ناقدانہ کوشش ہے' اگر اس کا نقش ثانی تیار ہو جاتا تو یقیناً یہ کتاب دار العلوم پر ایک مستند ماخذ شمار ہوتی۔ (۱)

دیوبند ضلع سہارن پور کی ایک تاریخی بستی ہے جو سہارن پور سے ۲۲ میل اور دہلی سے ۹۰ میل کے فاصلہ پر گنگا اور جمنا کے مابین دو آبہ میں واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پانڈوؤں نے اپنی جلاوطنی کے دنوں میں یہاں پر قیام کیا تھا۔ اس شہر کے نام سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کی مقدس جگہ رہی ہے۔ یہاں سندر دیوی کا مندر ہے جہاں آج بھی چیت کے مہینے میں سالانہ میلہ لگتا ہے۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دیوبند' دیوی اور بند (سندر دیوی کا قلعہ) سے مرکب ہے' جو مرور زمانہ سے دیوبند بن گیا۔ مسلمانوں کا بھی اس شہر سے پرانا تعلق ہے۔ سکندر لودھی نے ۱۵۰۷ء میں یہاں جامع مسجد بنوائی تھی' ایسے ہی اورنگ زیب نے ۱۶۶۳ء میں یہاں ایک مسجد بنوائی۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں دیوبند میں قلعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ (۲) موجودہ وقت میں قصبہ کی آبادی تقریباً پچاس ہزار کے قریب ہوگی' کیونکہ ۱۹۵۱ء میں مردم شماری کے مطابق قصبہ کی آبادی ۲۵'۸۷۲ افراد پر مشتمل تھی جن میں ۱۵'۴۳۴ مسلمان تھے۔

قصبہ کو اس طرح سے بسایا گیا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی آبادی الگ الگ ہے۔ ہندوؤں کے محلے میں مسلمانوں کی اور مسلمان محلوں میں ہندوؤں کی آبادی بہت کم ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد یہاں کے ایک خدا رسیدہ بزرگ حاجی محمد عابد (وفات ۱۹۱۲ء) نے شہر کے اہل علم سے مشورہ کیا اور کہا "علم دین اٹھا جاتا ہے' کوئی تدبیر کرو کہ علم دین باقی رہے۔ جب عالم نہیں رہیں گے' کوئی مسئلہ بتانے والا بھی نہ رہے گا۔ جب سے دہلی کا مدرسہ گم ہوا ہے' کوئی علم دین نہیں پڑھتا" (۳) سب نے اس مشورہ کو قبول کیا اور حاجی صاحب نے پہل کر کے اپنی طرف سے چندہ دیا' اور پھر چندہ جمع کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چونکہ سید محمد عابد' جو سید عابد حسین کے نام سے بھی معروف ہیں' شہر میں اپنی بزرگی وپارسائی میں معروف ومحبوب تھے اس لیے ہر شخص نے چندہ دینے میں اعزاز جانا' تھوڑی ہی دیر میں چار سو روپے اکٹھے ہو گئے' جس پر انہوں نے میرٹھ میں مقیم مولانا محمد قاسم کو لکھا کہ آپ پڑھانے کے لیے دیوبند تشریف لائیں۔ مولانا محمد قاسم نے جواب میں لکھا:

"میں بہت خوش ہوا' خدا بہتر کرے' مولوی ملا محمود صاحب (وفات ۱۸۸۶ء) کو پندرہ روپے ماہوار مقرر کر کے بھیجتا ہوں' وہ پڑھا دیں گے' اور مدرسہ مذکورہ میں ساعی رہوں گا۔" (۴)

چنانچہ محمود صاحب نے ۱۵/ محرم ۱۲۸۳ھ (۳۰ مئی ۱۸۶۶ء) کو شہر کی ایک قدیم مسجد چھتہ میں درس دینا شروع کر دیا۔ اتفاق سے پہلے طالب علم کا نام بھی محمود ہی تھا' جو آگے چل کر مذہبی حلقوں میں شیخ الہند (وفات ۱۹۲۰ء) کے نام سے مشہور ہوئے۔ پہلا درس مسجد میں انار کے درخت کے نیچے دیا گیا۔ حاجی صاحب کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ دلی کی بربادی کے بعد دیوبند میں مدرسہ کا قیام مسلمانوں کی دینی خدمت کے لیے ضروری تھا' نیز یہ کہ پرانے علماء کی' جو دنیا سے جا رہے تھے' جگہ کو پر کرنے کا یہی ایک معقول طریقہ تھا' تا کہ مذہبی احکام کی نشرواشاعت کا کام برابر جاری رہے۔ اس خط سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مدرسے کے قیام میں سب سے پہلا قدم حاجی صاحب نے اٹھایا اور مولانا محمد قاسم اس وقت میرٹھ میں قیام پذیر تھے۔ اگر حاجی صاحب یہ قدم نہ اٹھاتے تو خدا جانے کب تک یہ تجویز تخیل کی دنیا میں پڑی رہتی۔ البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ مدرسہ کے علمی اور بنیادی مقصد کو بروئے کار لانے کی صلاحیت مولانا قاسم رکھتے تھے۔ اس لیے ان سے رجوع کیا گیا' اور انہوں نے بھی فورا" اثبات میں جواب دیا۔ چونکہ معاملہ باہمی اعتماد' اخلاص اور دینی خدمت کا تھا' اس لیے انتظام وانصرام سے متعلق باتوں پر وقت ضائع نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ہر ایک آدمی نے اپنے مزاج کے مطابق اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالا' انتظامی اور مالیاتی امور کے نگران حاجی صاحب قرار پائے' کیونکہ وہی مدرسہ کے بانی تھے' انہوں نے مدرسہ کی مجلس شوریٰ قائم کی' جس میں مولانا محمد قاسم' مولانا فضل الرحمٰن' مولانا ذو الفقار علی' مولوی مہتاب علی اور منشی فضل الحق رکن قرار پائے۔ حاجی صاحب نے شوریٰ کے سرپرست اور مہتمم مدرسہ کی حیثیت سے کوئی تنخواہ نہیں لی۔ مدرسہ کی پہلے سال کی سالانہ روئیداد میں جن لوگوں کے نام "نام مہتممان" کے عنوان سے دیے گئے ہیں' وہ یہ ہیں: ۱۔ حاجی عابد حسین' مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی' مولوی مہتاب علی صاحب' مولوی ذو الفقار علی صاحب' مولوی فضل الرحمٰن صاحب' منشی فضل حق' شیخ نہال احمد۔ مولوی ذو الفقار علی اور مولوی فضل الرحمٰن' انگریزی حکومت کے ملازم رہ چکے تھے

مدرسہ کا قیام اپنی نوعیت کے اعتبار سے کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جسے وقت کا کوئی انقلابی قدم قرار دیا جائے کیونکہ اسلامی تعلیم کے لیے مدرسہ کا قیام کوئی انوکھا تجربہ نہیں تھا' اس

قسم کے مدارس فرنگی محل، لکھنؤ اور دہلی میں موجود تھے، جن کا تعلیمی نصاب درس نظامی تھا اور یہی درس نظامی اس جدید مدرسہ میں بھی اختیار کیا گیا، البتہ یہ جدید مدرسہ اپنی دو ایک باتوں میں وقت کی دوسری درسگاہوں سے ممتاز تھا:

(ا) مدرسہ کے بانیوں نے انگریزی علوم کی مخالفت کی اور نہ ہی اس کی پرزور تائید، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انہوں نے جدید علوم کی طرف ذہنی رجحان رکھنے کے باوجود غیر جانبدارانہ موقف اختیار کیا۔ ہرچند وہ شاہ عبد العزیز کی اس رائے سے اتفاق رکھتے تھے کہ انگریزی زبان پڑھنا جائز ہے، ان کی اپنی توجہ مسلمانوں کے قدیم ورثہ پر مرکوز رہی، اور ان کی ساری توانائیاں اپنے نصب العین کے حصول کے لیے وقف ہو کر رہ گئیں۔ وہ جدید اور قدیم علم کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کو اپنے بنیادی مقصد کے لیے نقصان دہ جانتے تھے۔ مولانا محمد قاسم نے مدرسہ کی ایک سالانہ تقریب (۱۹ ذی قعد ۱۲۹۰ھ، ۹ جنوری ۱۸۷۴ء) میں جدید علوم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی۔ ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا تحصیل حاصل نظر آیا۔"

اس تقریر سے صاف عیاں ہے کہ مولانا اور ان کے ساتھی علوم جدیدہ کے خلاف نہیں تھے، البتہ انہوں نے علوم جدیدہ کو اپنے نصاب تعلیم کا حصہ نہیں بنایا، اس کی ایک وجہ تو یہ نظر آتی ہے کہ مولانا اور ان کے ساتھی یورپ کی نئی سیاسی طاقت، تمدن اور فلسفہ تعلیم سے، جنہوں نے کہ صدیوں پرانی علمی بساط کو لپیٹ کر رکھ دیا تھا، جمال الدین افغانی جیسی آگہی نہیں رکھتے تھے۔ البتہ وہ نئی تہذیب کو مسلم عقائد، مذہبی روایات اور انداز فکر کا حریف جانتے تھے۔ اس احساس نے ان کے سامنے قدامت پسندی کی راہ کھولی تھی، جس پر چل کر مسلمان اپنی مذہبی روایات کو بچا سکتے تھے۔ البتہ ان کی یہ بھی رائے تھی کہ مدرسہ میں پرانے علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی تدریس طالب علموں کے لیے بوجھ اور مشکلات کا باعث بن سکتی ہے۔ چنانچہ مولانا نے اپنی اسی تقریر میں فرمایا "زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے"

بے شبہ مولانا کی زندگی میں مدرسہ کے نصاب تعلیم میں نئے علوم کو جگہ نہیں ملی، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار مشکل ہے کہ مولانا اور دوسرے سنجیدہ علماء نے نئے علوم کی مخالفت نہیں کی، اس لیے کہ دوسری قوموں کے علوم وفنون اور زبانوں کو سیکھنا علمائے حق کا

ہمیشہ سے شعار رہا ہے۔ البتہ ان کی نگہ بصیرت جدید تہذیب وثقافت کی روح کو بھی بے نقاب دیکھ رہی تھی۔ یہ روح' جسے روح الحاد سے تعبیر کرنا مبالغہ نہ ہوگا' غرضیکہ علماء نے جدید علوم کی حیثیت سے مخالفت نہیں کی۔ جدید علوم کے بارے میں بانیان دیوبند کا معاندانہ رویہ اختیار نہ کرنا ایک صحت مند قدم تھا' جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ گزشتہ صدی کی مذہبی اور علمی زندگی کی ابتری کو سامنے رکھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔

(۲) مدرسہ دیوبند کی دوسری امتیازی خصوصیت جو اسے اپنے معاصر یا پیش رو درس گاہوں سے ممتاز کرتی ہے' یہ ہے کہ اس کا انحصار خدا اور عوام پر تھا۔ وہ سرکاری اثر ونفوذ سے یک قلم آزاد رہا۔ اس نے اپنے بقاء کے لیے نہ صرف سرکاری امداد پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ اس امداد کو اپنے مقصد کے لیے نقصان دہ خیال کیا۔ مولانا محمد قاسم نے مدرسہ کے آٹھ بنیادی اصولوں کے ضمن میں کہا ہے:

"سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں مدرسہ کا سب سے قیمتی سرمایہ رجوع الی اللہ ہے۔ اس تعلق کو ہر صورت میں باقی رہنا چاہیے۔ جس دن یہ رشتہ ٹوٹ گیا اور مادی سہاروں مثلاً" جاگیر یا کارخانہ یا تجارت پر اعتماد کیا گیا' اس دن مدرسہ کا مشن ختم ہو جائے گا۔ نیز یہ کہ اسے عوام کی امداد پر بھروسہ کرنا چاہیے جو نام ونمود سے الگ رہ کر چندہ دیتے ہیں۔" (۵)

مدرسہ کی پالیسی کا یہی بنیادی پتھر تھا' جس نے آگے چل کر بیسویں صدی کے پہلے نصف حصہ میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس پالیسی نے یہ بھی بتا دیا کہ مسلمانوں کی دینی و علمی قیادت عوام پر پورا اعتماد کر سکتی ہے جو اپنے مذہبی تشخص کے بچاؤ کے لیے پورا شعور رکھتے ہیں۔ اگر مدرسہ کے معاصر جدید علمی ادارے بھی جو جدید تعلیم کے نقیب تھے' اس موقف کو اختیار کرتے اور عوام کو ساتھ لے کر اپنی منزل کی طرف بڑھتے' تو وہ علمی میدان میں مثبت اور صحت مند کردار ادا کر سکتے تھے اور ان ٹھوکروں سے بچ سکتے تھے' جو خود اعتمادی کے فقدان کی وجہ سے انہیں قدم قدم پر کھانا پڑیں۔ اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبالؒ نے اپنے ایک مکتوب بنام سید سلیمان ندوی کہا تھا: "گزشتہ پانچ سال کے تجربہ نے مجھے بے حد افسردہ کر دیا ہے۔ مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ انتہائی پست فطرت ہے۔"

مدرسہ دیوبند کی اس آزاد پالیسی کا اعتراف خود اس کے معاصرین نے بھی کیا۔ مولانا شبلی مرحوم نے ندوۃ العلماء کے ایک سالانہ اجلاس میں کہا تھا:

"عربی کے جو بیسیوں مدرسے کان پور میں قائم ہیں' وہ کس نے قائم کیے ہیں؟

سوداگروں نے، دنیا داروں نے .... کسی عالم نے نہیں قائم کیے سوائے مدرسہ دیوبند کے جس پر ہم فخر کرتے ہیں، جو کہ مولانا قاسم مرحوم نے قائم کیا تھا۔ علاوہ اس کے مدرسہ کسی عالم نے قائم نہیں کیا۔" (۶)

مدرسہ کی عمارت

جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ مدرسہ کی ابتدا چھتہ مسجد میں ہوئی، جب طالب علموں کی تعداد بڑھی تو قاضی مسجد اور کرایہ کے مکانات میں درس دیا جانے لگا۔ شہر کی جامع مسجد میں اس غرض کے لیے کمرے بنوائے گئے چنانچہ چند سال اس مسجد میں درس وتدریس کے حلقے جمتے رہے۔ آخر میں طے پایا کہ مدرسہ کی اپنی مستقل عمارت ہونی چاہیے جہاں روئیداد مدرسہ ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) کے مطابق "ایک مکان وسیع، بافراغت، جس میں قریب سو کے طلبہ باآرام تمام رہ سکیں، اور چار پانچ درسگاہیں بھی ہوں اور دفع حوائج ضروریہ کی جگہ بھی اس میں ہو، تیار ہو۔" چنانچہ نئی عمارت کے لیے چندہ کی اپیل کی گئی اور عطیات اور چندہ بھیجنے کے لیے سید محمد عابد ہی کا نام دیا گیا' یہ اپیل کامیاب رہی اور "آرزو دیرینہ جس کی سال ہا سال سے امید تھی .... ایک قطعہ نہایت واسطے تعمیر مکانات کے خرید لیا گیا۔" مدرسہ کی روئیداد ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں کہا گیا ہے کہ مدرسہ میں تقسیم اسناد کا رسمی اجلاس منعقد ہوا، جس میں دیوبند سے باہر کے لوگ بھی شریک تھے۔ اس موقع پر مدرسہ کی اپنی مستقل عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا:

"اول پتھر بنیاد کا جناب مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری نے اپنے دست مبارک سے رکھا اور بعد میں جناب مولانا محمد قاسم و مولوی رشید احمد صاحب، مولانا مولوی محمد مظہر صاحب نے ایک ایک اینٹ رکھی۔" (۷)

گویا قیام مدرسہ کے تقریباً ۹ سال بعد مدرسہ کی اپنی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ مدرسہ کی عمارت سے متعلق ارباب مدرسہ کی جدوجہد کا ذکر مدرسہ ہی کی شائع کردہ سالانہ رپورٹوں میں ملتا ہے۔ جدید عمارت کے لیے چندہ کی اپیل، عطیات کے لیے سید محمد عابد کا نام، زمین کی خرید بنام حاجی صاحب غرضیکہ یہ ساری باتیں مدرسہ کی سالانہ رپورٹوں ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء)، ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں درج ہیں۔ نیز سید عابد صاحب کے سوانح حیات تذکرہ العابدین میں، جو سید صاحب اور مدرسہ کے بارے میں قدیم مستند دستاویز شمار ہوتی ہیں، جدید عمارت کا تذکرہ موجود ہے جو مدرسہ کی سالانہ روئیدادوں سے مختلف نہیں۔ لیکن "ارواح

ثلاثہ" میں کہا گیا ہے، کہ جدید عمارت کی پہلی اینٹ مولانا اصغر حسین کے نانا مرحوم نے رکھی۔ نیز یہ کہ حاجی سید عابد صاحب، نئی عمارت بنانے کے خلاف تھے۔ وہ ناراض ہو کر چھتہ مسجد میں چلے گئے۔ لیکن مولانا محمد قاسم کی درخواست پر نہ صرف تقریب میں شریک ہوئے، بلکہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معذرت بھی پیش کی۔ (۸)

واقعہ یہ ہے کہ "ارواح ثلاثہ" میں خوش اعتقادی نے بعض واقعات کو افسانہ بنا دیا ہے۔ ورنہ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ مدرسہ کی اپنی شائع کردہ رپورٹوں اور "تذکرۃ العابدین" کے مقابلے میں ارواح ثلاثہ کی روایات کوئی وزن نہیں رکھتیں۔ یہ امر موجب حیرت ہے کہ میاں سید محمد میاں جیسے فاضل آدمی نے بھی انہیں صحیح تسلیم کر لیا۔ مثلاً مولانا محمد قاسم صاحب کے ذکر میں مولانا محمد میاں فرماتے ہیں:

> "اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دارالعلوم کے پر شوکت تصور سے حضرت حاجی صاحب کا ذہن خالی تھا۔ جس مقدس بزرگ نے معمولی مکتب کے خاکے پر دارالعلوم جیسی عظیم الشان تجویز کی بنیاد رکھی، وہ حجت الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب کی ذات گرامی تھی۔" (۹)

سوال یہ ہے کہ اگر حاجی صاحب کے ذہن میں مدرسہ نہیں، مکتب کا تصور تھا تو پھر حاجی صاحب دلی کی درسگاہوں کی بربادی پر افسوس کیوں کرتے؟ اور یہ کیوں لکھتے کہ مدرسہ کا قیام عمل میں نہ آیا تو دینی مسائل اور احکام بتانے والا کوئی نہیں ملے گا۔ کیا مکتب کا قیام دینی مسائل کی تحقیق کے لیے ناکافی تھا؟ اگر حاجی صاحب نئی عمارت کی تعمیر کے خلاف ہوتے تو پھر نئی عمارت کے لیے چندہ کی اپیل اور انہی کے نام پر زمین خریدنے کا اعلان کیوں کیا جاتا؟ تذکرۃ العابدین میں نئی عمارت کی تعمیر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جب اہل شوریٰ نے مدرسہ کی مستقل عمارت بنانے کا تذکرہ کیا، تو حاجی صاحب نے کہا کہ یہ بات پہلے سوچنی چاہیے تھی تاکہ جامع مسجد میں جس پر اس عہد میں ڈیڑھ لاکھ روپے صرف ہوئے تھے، مزید کمرے نہ بنوائے جاتے۔ اہل شوریٰ حاجی صاحب کا جواب سن کر خاموش ہو گئے اور بعد میں مولانا محمد قاسم نے حاجی صاحب سے معذرت کی کہ "مجھ کو معلوم نہیں تھا کہ اہل شوریٰ نے آپ سے پہلے ذکر نہیں کیا اور خفیہ طور سے مشورہ کیا ہے، میں معافی چاہتا ہوں۔" لیکن ایک مدت کے بعد

> "ایک روز حاجی صاحب کو خود خیال آیا اور اہل شوریٰ سے کہا کہ مدرسہ علیحدہ بنانا چاہیے، اور مدرسہ کے واسطے جگہ خریدنی چاہیے۔ اہل شوریٰ نے کہا کہ اگر آپ

کی رائے ہے تو بہت بہتر ہے۔ مگر آپ ہی جگہ تجویز کر کے خرید فرمایئے۔ چند روز کے بعد حاجی صاحب نے جگہ تجویز کر کے خرید کی کہ جس کا بیعانہ بھی حاجی صاحب کے نام ہے۔ مولوی رفیع الدین صاحب جو کہ مہتمم مدرسہ تھے' اہتمام سپرد کیا' جو کہ بفضلہ تعالیٰ آج ایک لاکھ روپیہ کی تعمیر کا مدرسہ بنا رہے ہیں۔"[۱۰]

یہ ہے مدرسہ کی نئی عمارت بنانے کا واقعہ' اس لیے یہ کہنا صحیح ہو گا کہ جدید عمارت کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی سہارن پوری نے رکھا' نیز یہ کہ نئی عمارت کے بنوانے میں حاجی صاحب نے حسب روایت نمایاں طور پر حصہ لیا۔ یہاں پر ارواح ثلاثہ کی ایک دوسری روایت کا تذکرہ بے جا نہ ہو گا۔ ارواح کی ایک روایت میں آیا ہے کہ دہلی میں نجف خان نے شاہ ولی اللہ کے پہنچے اتروا دیے تھے تا کہ کوئی کتاب نہ لکھ سکیں اور شاہ عبد العزیز اور شاہ رفیع الدین کو دہلی سے جلاوطن کر دیا تھا۔ اس روایت کو مولانا گیلانی نے تذکرہ شاہ ولی اللہ" میں' مولانا محمد میاں نے علمائے ہند کا شاندار ماضی' (ترجمہ شاہ عبد العزیز) میں نقل کیا ہے۔ ارواح کی یہ روایت بھی دوسری روایات کی طرح بے بنیاد ہے۔ کیونکہ نجف خان' شاہ ولی اللہ کے انتقال کے بعد دہلی میں آیا ہے۔ اس نے ۱۷۸۲ء میں وفات پائی' اس وقت تک شاہ عبد العزیز نے اپنی کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" تصنیف نہیں کی تھی۔[۱۱] غرضیکہ مدرسہ کی اپنی سالانہ رپورٹوں اور مدرسہ سے متعلق قدیم ماخذ کو چھوڑ کر ارواح ثلاثہ کی روایات کو تحقیق و تنقید کے بغیر قبول کرنا مناسب نہیں۔ چنانچہ مولانا محمد میاں صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ حاجی محمد عابد' مدرسہ کی نئی عمارت بنانے کے خلاف تھے' یا ان کے ذہن میں مدرسہ نہیں مکتب کا تصور تھا' حالانکہ دیوبند میں پہلے سے مکتب بھی موجود تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد قاسم کی اپنی مستقل حیثیت ہے' جو اپنے بے داغ کردار اور پاکیزہ سیرت کی بناء پر ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ اس سے اظہار عقیدت کے لیے نہ تو تاریخی حقائق کا انکار ضروری ہے اور نہ ہی سید محمد عابد کی پاکیزہ شخصیت کو نظر انداز کرنا یا اس کے وقار کو مجروح کرنا ضروری ہے۔ مقام مسرت ہے کہ علماء دیوبند نے اب اس حقیقت کا اعتراف کر لیا ہے کہ دارالعلوم کے اصل بانی حاجی سید محمد عابد ہیں' مولانا محمد قاسم نہیں جو قیام مدرسہ کے وقت ہی نہیں' اس کے بعد بھی کئی سال تک میرٹھ میں قیام پذیر رہے۔[۱۲]

یہاں پر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مولوی ذوالفقار صاحب نے' جن کا نام مدرسہ کی پہلی رپورٹ میں مدرسہ کے مہتممان میں درج ہے' مدرسہ پر ایک کتابچہ "الهدية السنية فی ذکر المدرسة الاسلامية" کے نام سے حاجی صاحب کی زندگی ہی میں

شائع کیا جس میں انہوں نے دل کھول کر حاجی صاحب کی شخصیت کو خراج ادا کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے بہ الہام خداوندی مدرسہ کے قیام کے لیے اہل خیر سے امداد کی اپیل کی۔ اس کتابچہ میں انہوں نے مولانا محمد قاسم کا ذکر بھی عقیدت واحترام سے کیا ہے۔ ان تمام شواہد و دلائل کے پیش نظر اس امر سے مجال انکار نہیں کہ دارالعلوم کے بانی جو شروع میں "مدرسہ عربی اسلامی" نام سے معروف تھا' حاجی محمد عابدؒ ہیں' مولانا محمد قاسم نہیں۔

مدرسہ کی ایک سالانہ رپورٹ ۱۲۸۳ھ (۱۸۷۰ء) سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداء میں مدرسہ کا نصاب تعلیم دس سال پر مشتمل تھا' اس میں وہی نصاب پڑھایا جا رہا تھا' جو دہلی یا لکھنؤ کے مدارس میں درس نظامی کے نام سے رائج تھا۔ لیکن دو سال کے بعد (۱۲۸۵ھ) مدرسہ کی ایک کمیٹی نے نصاب کی مدت' دس سال کی بجائے چھ سال مقرر کر دی اور نصاب سے فارسی کتابوں کے علاوہ منطق و فلسفہ کی پرانی کتابیں بھی خارج کر دیں۔ البتہ فلسفہ میں "میبذی" داخل نصاب رہی۔ یہ نصاب مختصر ہونے کے باوجود اسلامیات کی تعلیم کے لیے کافی تھا۔ اس نصاب میں مختصر مضامین کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں مقرر تھیں:

۱۔ تفسیر:	بیضاوی
۲۔ حدیث:	صحاح ستہ
۳۔ فقہ:	ہدایہ
۴۔ اصول فقہ:	توضیح تلویح
۵۔ عربی ادب:	مقامات حریری' کلیلہ ودمنہ' دیوان حماسہ' دیوان متنبی
۶۔ فلسفہ:	میبذی
۷۔ منطق:	ایساغوجی' قال اقول' مرقات' تہذیب' قطبی' میر قطبی
۸۔ تاریخ:	تاریخ یمینی

اس چھ سالہ نصاب میں عربی ادب کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا گیلانی نے لکھا ہے کہ ان کتابوں کو داخل نصاب کرنے سے مولانا محمد قاسم کا مقصد جدید تعلیم یافتہ گروہ کو مطمئن کرنا تھا جو کہتا تھا کہ انگریزی سکولوں کے طالب علم' انگریزی بولنا اور لکھنا جانتے ہیں' جب کہ درس نظامی کے فارغ التحصیل طلبہ نہ تو عربی زبان بول سکتے ہیں اور نہ ہی لکھ سکتے ہیں۔[۱۳] مولانا گیلانی نے عربی ادب کی کتابوں کو داخل نصاب کرنے کی جو توجیہ یا علت بیان کی ہے' وہ ہمارے نزدیک محل نظر ہے۔ اس لیے کہ مولانا محمد قاسم اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ قرآن و سنت سے معارف واسرار کا سراغ لگانے کے لیے عربی زبان پر عبور حاصل

کرنا بنیادی شرط ہے اور یہ عبور عربی ادب اور اساتذہ فن کے کلام کو پڑھے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ اگر جدید گروہ ہی کو مطمئن کرنا مقصود ہوتا جیسا کہ مولانا گیلانی فرماتے ہیں' تو پھر مولانا محمد قاسم' نصاب میں عربی ادب کا نہیں بلکہ جدید مضامین کا اضافہ کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی ادب' نصاب تعلیم کا ہمیشہ سے اہم حصہ رہا ہے۔ اس لیے مولانا قاسم نے اس روایت کو ترک کرنا مناسب نہیں جانا۔

درس نظامی کی مدت کو کم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ایک طالب علم مدرسہ سے فارغ ہو کر سرکاری مدارس میں جا کر اپنی علمی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکے۔ مولانا نانوتوی نے اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا: "اس کے بعد (مدرسہ میں دینی تعلیم کے بعد) اگر طلبہ مدرسہ ہذا' مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں' تو ان کے کمال میں بات زیادہ موثر ثابت ہوگی۔" ہم پہلے یہ کہہ چکے ہیں کہ بانیان مدرسہ نئی تعلیم کے خلاف نہیں تھے بلکہ وہ تو اسے' جیسا کہ مولانا نے کہا ہے' علمی صلاحیتوں کو صیقل کرنے کے لیے ضروری گردانتے تھے۔ لیکن مولانا کی یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف دارالعلوم کے پڑھے ہوئے لوگ نئی دانش گاہوں میں نہیں گئے' بلکہ دس سالہ نصاب کو سبک بنانے کے لیے منطق کی جو کتابیں خارج کی گئی تھیں' انہیں پھر ۱۲۹۰ھ میں واپس لایا گیا کیونکہ منطقی علماء چھ سالہ دینی نصاب کے فارغ التحصیل طالب علموں کو عالم ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ دارالعلوم کے نصاب کو سطحی قرار دیتے کیونکہ ان کی رائے میں منطق کی کتابوں اور ان کے حواشی کی ورق گردانی کے بغیر "علم پختہ" نہیں ہوتا تھا۔"[۱۳] چنانچہ منطق و فلسفہ کی ساری کتابیں' مثلاً" ملا حسن' حمد اللہ' قاضی مبارک' صدرا' شمس بازغہ اور دوسری کتابیں نصاب میں داخل کی گئیں' اور نصاب کی مدت چھ سال سے بڑھا کر آٹھ سال کر دی گئی۔

نئے علوم سے متعلق نہ صرف مولانا کی آرزو پوری نہیں ہوئی' بلکہ نصاب تعلیم کو بیرونی دباؤ کے پیش نظر پھر بوجھل بنا دیا گیا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ مولانا کے جانشینوں نے کبھی بھی سنجیدگی سے مولانا کے علمی افکار کو موضوع بحث نہیں بنایا اور نہ ہی ان کی علمی تمناؤں کو بروئے کار لانے کے لیے کوئی قدم اٹھایا۔ مولانا گیلانی کا خیال ہے کہ مولانا محمد قاسم کی وفات سے یہ خواب حقیقت نہ بن سکا اور دارالعلوم کے طالب علم بہ قول مولانا گیلانی چند نفسیاتی وجوہ کی بناء پر سرکاری مدارس میں نہ جا سکے۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ مولانا محمد قاسم' اپنی اس تقریر کے بعد چار سال تک زندہ رہے۔ اس لیے اس تجویز کی ناکامی کی ذمہ داری ان کی موت پر مشکل ہی سے ڈالی جا سکتی ہے۔ اصل بات یہ ہے

کہ مولانا اور ان کے ساتھیوں نے اپنے عہد میں رائج نصاب تعلیم کو اختیار کیا اور پھر دو سال کے بعد اس نصاب میں کمی کر دی تا کہ طالب علم جدید علوم سے فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن انہوں نے خود اپنے ہاں جدید علوم کو پڑھانے کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا' اس لیے کہ ان کی رائے میں ایک ہی وقت میں دو علوم کو پڑھانا سودمند نہ تھا۔ چنانچہ مولانا نے نہ تو اپنے نصاب میں علوم جدیدہ کو داخل کیا اور نہ ہی قدامت پسند حلقوں کی دل پسند فلسفیانہ و منطقیانہ کتابوں کو نصاب میں جگہ دی۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں اصل مقصد کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے خوب سوچ سمجھ کر ایک راہ اختیار کی اور پھر اس پر وہ استقامت کے ساتھ چلتے رہے اور جس رائے کو صحیح سمجھا' اس کا اظہار کرتے رہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے عہد کے عام "مذہبی خیالات" کا لحاظ کیے بغیر علماء کی محفل میں علوم جدیدہ کی حمایت میں تقریر کی' اگر وہ علوم جدیدہ کو شامل نصاب کرنے کے حق میں ہوتے تو وہ یقیناً انتہا پسند حلقوں کی مخالفت کی پرواہ کیے بغیر انگریزی زبان اور دوسرے معاشرتی علوم کو نصاب میں جگہ دیتے' لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ اس طریق سے ان کے اصل مقصد (قدیم ورثے کا تحفظ) کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ البتہ انہوں نے وقت کے معقولی مولویوں کے غیر سنجیدہ اور معاندانہ رویہ کے پیش نظر منطق کی خارج شدہ کتابوں کو دوبارہ نصاب میں شامل کر لیا جس سے غالباً ان کا مقصد مدرسہ اور اہل مدرسہ کو تنگ نظر علماء کے عناد اور اس کے برے اثرات سے بچانا تھا۔

مولانا کی وفات کے بعد تو ساری کتابیں نصاب کا حصہ بن گئیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہی منطق و فلسفہ کے خلاف تھے' اور فرمایا کرتے: "اس منطق و فلسفہ سے تو انگریزی بہتر ہے کہ اس سے دنیا کے نفع کی تو امید ہے۔" چنانچہ مولانا گنگوہی کے زمانہ میں چند سال منطق و فلسفہ کی کتابیں نصاب سے خارج رہیں' لیکن داخلی اور خارجی دباؤ اس قدر شدید تھا کہ خارج شدہ کتابیں دوبارہ نصاب تعلیم کا حصہ بنیں' اور ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۳ء) میں درس نظامی اپنی پہلی صورت میں جنم لے کر واپس آگیا۔ درس نظامی کو اس کی پہلی صورت میں قبول کرنے اور نئے علوم سے مکمل اجتناب سے جو نتائج برآمد ہوئے' اس پر مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

> "لیکن مولویت کا اس زمانہ میں جو ماحول تھا' اس نے پھر مجبور کیا اور نکلی ہوئی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے میں لوگ پھر وقت ضائع کرتے رہے اور آج تک اضاعت اوقات کا وہی سلسلہ جاری ہے ..... لیکن واضح اسباب جن کی وجہ سے آپ (مولانا محمد

قاسم) کا تعلیمی نصب العین بروئے کار نہ آسکا اور قدیم و جدید علوم والسنہ کے پیوند و گرہ اندازی کی جو مہم آپ سر کرنا چاہتے تھے' افسوس ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا نظام تعلیم' مان لینا چاہیے' کہ اس وقت تک اس کے سر کرنے میں ناکام رہا ہے۔" (۱۵)

موجودہ وقت میں دارالعلوم میں آٹھ سالہ نصاب پڑھایا جا رہا ہے۔ اس میں تقریباً" وہی کتابیں داخل ہیں جو ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں پڑھائی جا رہی تھیں۔ اس نصاب کی تکمیل پر طالب علم کو "عالم" (۱۶) کی سند دی جاتی ہے۔ اس نصاب کی فہرست یہ ہے:

صرف: میزان الصرف' منشعب' پنج گنج' علم الصیغہ
فصول اکبری' مراح الارواح

نحو: نحو میر' شرح مأۃ عامل' ہدایت النحو' کافیہ' شرح جامی

عربی ادب: مفید الطالبین' نفحۃ الیمن' مقامات حریری

منطق: صغریٰ' کبریٰ' مرقات' شرح تہذیب' قطبی
میر قطبی' سلم العلوم' ملاحسن

فلسفہ: ہدیہ سعیدیہ' میبذی

فقہ: نورالایضاح' قدوری' کنز الدقائق شرح وقایہ
ہدایہ اولین' ہدایہ آخرین

اصول فقہ: اصول الشاشی' نور الانوار' حسامی' توضیح تلویح

علم بیان: مختصر معانی' تلخیص المفتاح

علم کلام: مسامرۃ' شرح عقائد نسفی

ہیئت: تصریح

علم الفرائض: سراجی' اصول افتاء' رسم المفتی

اصول تفسیر: الفوز الکبیر

اصول حدیث: شرح نخبۃ الفکر

حدیث: مشکوۃ شریف' صحاح ستہ (صحیح بخاری' صحیح مسلم'
ابو داؤد' ترمذی' ابن ماجہ' نسائی) موطا امام مالک'
موطا امام محمد' شمائل ترمذی

اس نصاب کی تکمیل کے بعد اگر طالب علم مزید ایک سال قیام کرے اور تفسیر کی دو کتابوں: تفسیر ابن کثیر اور تفسیر بیضاوی کو مکمل پڑھ لے تو اسے "فاضل" کی سند دی جاتی

ہے۔ لیکن اگر وہ درجہ فضیلت کے بعد مزید دو سال علمی سفر جاری رکھے تو اسے "کامل" کی سند سے نوازا جاتا ہے۔ ان اسناد کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، جامعہ ازہر قاہرہ نے تسلیم کر لیا ہے۔ ان اسناد میں جو عربی زبان میں ہوتی ہیں، نہ صرف پڑھی ہوئی کتابوں کا اندراج ہوتا ہے، بلکہ ان میں طالب علم کی ذہنی استعداد، علمی مہارت اور اخلاقی حالت کا بھی ذکر ہوتا ہے چونکہ طالب علم اپنی علمی استعداد اور اخلاقی حالت کے اعتبار سے مختلف مقامات رکھتا ہے، اس لیے یہ اسناد بھی ادنیٰ، متوسط، اعلیٰ درجات رکھتی ہیں۔ درجہ تکمیل میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل نصاب ہیں:

ادب	دیوان حماسہ، دیوان متنبی، معلقات سبعہ (کلاسیکی شاعری کا شہرہ آفاق کلام)
عروض	نقطہ الدائرۃ
معانی	مطول
منطق	میر زاہد، رسالہ میر زاہد، ملا جلال، حمد اللہ، قاضی مبارک
فلسفہ	صدرا، شمس بازغہ
علم کلام	خیالی، امور عامہ، جلالی
مناظرہ	رشیدیہ
اصول فقہ	مسلم الثبوت
ریاضی	خلاصہ الحساب، اقلیدس
ہیئت	شرح چغمینی، سبع شداد
حکمت شرعیہ:	حجۃ اللہ البالغہ، عوارف المعارف (۱۷)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ دارالعلوم میں ہر طالب علم کو نہ صرف تعلیمی سال کے اختتام پر، جو ماہ رجب میں ختم ہو جاتا ہے، امتحان میں بیٹھنا پڑتا ہے بلکہ سہ ماہی اور شش ماہی امتحانات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ یہ امتحانات بڑے نظم وضبط کے ساتھ لیے جاتے ہیں، جن میں نقل یا دھوکہ دہی کے واقعات کا ظہور میں آنا تقریباً" ناممکن ہے۔ چونکہ امتحان میں پاس ہونے کے لیے کم از کم ساٹھ فیصد نمبروں کا حصول ضروری ہے، درجہ دوئم (سیکنڈ ڈویژن) اور درجہ اول (فرسٹ ڈویژن) حاصل کرنے کے لیے طالب علم کو کم از کم ۷۴ اور ۸۸ فیصد (بالترتیب) نمبروں کی ضرورت ہے۔ البتہ پہلے اور دوسرے سال کے طالب علم سے صرف زبانی امتحان (سوال۔ جواب) لیا جاتا ہے۔

ہرچند امتحانات کا طریقہ برصغیر کی بعض ریاستوں میں (مثلاً" بیجاپور) رائج تھا لیکن ایک

وقت کے بعد یہ طریقہ کم از کم شمالی ہندوستان میں متروک ہو چکا تھا۔ ایسے ہی شمالی ہندوستان کے مدارس میں طالب علموں کی درجہ بندی اور حاضری کا اہتمام بھی نہیں تھا۔ دارالعلوم نے اپنے طریق تعلیم میں امتحانات' طالب علموں کی درجہ بندی اور حاضری وغیرہ سے متعلق امور کو اختیار کر کے طالب علم کی علمی استعداد کو مضبوط بنانے کا سروسامان مہیا کر دیا۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ دارالعلوم میں داخل ہونے کے لیے بھی امتحان شرط ہے جس میں اکثر امیدوار ناکام ہو جاتے ہیں اور داخلہ سے محروم۔ چنانچہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جب طالب علم دارالعلوم کے نصاب کو مکمل کر کے فارغ ہوتا ہے تو وہ علمی میدان میں پورے اعتماد سے داخل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دارالعلوم کے طریق تعلیم کی ان تمام خوبیوں کے باوجود ہم یہ کہنے کی جسارت کریں گے کہ:

طلبہ کی فکری اور علمی ارتقاء کے لیے مولانا محمد قاسم نے جو خواب دیکھا تھا' وہ بوجوہ پورا نہ ہو سکا جس پر مولانا گیلانی نے مسلمانوں کے بخت واژگوں اور تقدیر کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ نصاب تعلیم کے بنیادی سقم پر دارالعلوم کے ایک دوسرے فاضل ہمدرد ڈاکٹر ضیاء الحسن فاروقی فرماتے ہیں:

"یہ بدقسمتی ہی تھی کہ مسلمان فلسفیوں کی خالص فکری کاوشوں کے باوجود فلسفیانہ فکر کی کوئی روایت قائم نہ کی جا سکی۔ فلسفہ پر قدامت پسندی کی فتح' فکری جمود پر منتج ہوئی۔ جس نے مسلمانوں کے دانشمندوں کی ساری تخلیقی صلاحیتوں کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ صحیح بات یہ ہے کہ ملا صدرا اور شمس بازغہ جیسی کتابیں پڑھنے والوں کے دلوں میں سنجیدہ عقلی سوچ بچار کی تڑپ یا لگن پیدا نہ کر سکیں' اس امر سے بھی مجال انکار نہیں کہ دارالعلوم کی صفوں سے فلسفے کو نکال باہر کرنا یا نصاب میں چند فرسودہ فلسفیانہ رسائل کا ابن سینا' فارابی اور ابن رشد کی کلاسیکی کتابوں کے لیے جگہ نہ چھوڑنا' ایک ایسا رجعت پسندانہ قدم ہے' جس نے اجتہاد کے دروازے کو عملی طور پر بند کر دیا۔ بہرنوع تقلید کے فطری جمود کا پھر بھی شکریہ کہ اس کی وساطت سے (پرانے) فلسفے نے دارالعلوم میں اپنی روایتی جگہ کو واپس لے لیا' واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم میں کسی صحت مند جدت کی روایت کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ منطق اور فلسفے میں تمام روایتی کتابوں کو جو درس نظامی کا حصہ ہیں' نصاب میں شامل کیا گیا۔ ایک آدمی یہ دیکھ کر واقعی حیران رہ جاتا ہے کہ آج بھی دارالعلوم کے نصاب میں امام غزالی کی تہافت الفلاسفہ اور شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ داخل نہیں ہے۔" (۱۸)

ڈاکٹر فاروقی کے ٹھوس تبصرہ سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو' یہ امر واقعی قابل حیرت

ہے کہ عبد الکریم القشیری' غزالی اور ابن عربی میں سے کسی کی کتاب کو نصاب میں جگہ نہ مل سکی حالانکہ تصوف اور اہل تصوف سے اہل دیوبند کو فکری اور جذباتی طور پر ہمیشہ گہرا تعلق رہا ہے۔ مزید یہ کہ خود شاہ ولی اللہ کے عہد میں یا ان سے قبل رائج نصاب میں تصوف کی متعدد کتابوں کے (عوارف المعارف' نقد النصوص' التعرف) نام ملتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنے سوانح میں اپنے درسیات کی جو فہرست دی ہے' وہ موجودہ درس نظامی کے مقابلے میں مختصر اور سبک ہے۔

نحو: کافیہ' شرح جامی

منطق: شرح شمسیہ' شرح مطالعہ

فلسفہ: شرح ہدایت الحکمہ

کلام: شرح عقائد نسفی

فقہ: شرح وقایہ' ہدایہ

اصول فقہ: حسامی

بلاغت: مختصر' مطول

حدیث: ترمذی' مشکوۃ' صحیح بخاری

تفسیر: مدارک' بیضاوی

درس و تدریس اور تصنیف و تالیف شاہ صاحب کا وظیفہ حیات تھا' چنانچہ وہ ایک جگہ اپنے تجربہ تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"طریق تعلیم (جس کی صحت) تجربہ سے پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے' یہ ہے کہ سب سے پہلے صرف و نحو کے مختصر رسائل' تین تین یا چار چار' طالب علم کی ذہنی استعداد کے مطابق پڑھائے جائیں' اس کے بعد تاریخ یا حکمت عملی کی کوئی کتاب' جو عربی زبان میں ہو' اسی وقت میں استاد طالب علم کو کتب لغت سے استفادہ کرنے اور ان کے مشکل مقامات کو حاصل کرنے کے طریق سے بھی آگاہ کرے۔ جب اسے (طالب علم) عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جائے' موطا امام مالک بروایت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی پڑھائی جائے' اسے (موطا کی تدریس) کسی صورت میں ترک نہ کیا جائے' یہ علم حدیث کی اساس ہے ..... اس کے بعد قرآن عظیم بلا زیادت درس دیں' اس طور پر کہ تفسیر کے بغیر صرف قرآن با ترجمہ پڑھا جائے اور جہاں کوئی نحو یا شان نزول کا مشکل سوال آجائے تو وہاں توقف کریں اور (اسے حل کرنے کے لیے) بحث کریں' اس کے

بعد تفسیر جلالین کا درس ہو' اسی قدر جتنا کہ قرآن مجید کا درس ہوا ہے۔ اس طرح پڑھنے میں بڑے فائدے ہیں۔ اس کے بعد ایک وقت میں حدیث کی کتابیں' مثلاً" صحیح بخاری' صحیح مسلم وغیرہ اور فقہ' عقائد اور سلوک (تصوف و اخلاق) کی کتابیں پڑھائیں اور دوسرے وقت میں کتب دانشمندی' مثلاً" شرح ملا اور قطبی' اگر ممکن ہو تو طالب علم ایک دن مشکوۃ پڑھے' دوسرے دن اس کی شرح طیبی' اسی قدر جس قدر پہلے دن مشکوۃ پڑھی تھی' یہ طریق نہایت نفع بخش ہے۔" (۱۹)

حضرت شاہ صاحب نے اپنے درسیات کی جو فہرست دی ہے' تقریباً" اسی قسم کا سبک نصاب تعلیم مولانا محمد قاسم نے شروع میں اختیار کیا تھا' جس کا ان کے معاصر معقولی مولوی مذاق اڑاتے تھے۔ شاہ صاحب کے علاوہ شاہ عبد العزیز نے اپنے ملفوظات میں درس تصوف میں لوائح' لمعات' شرح لمعات' درہ فاخرہ اور فتوح الغیب جیسی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے علمی خاندان سے دارالعلوم کو جو قلبی تعلق ہے' وہ سب پر عیاں ہے۔ دارالعلوم نہ صرف اپنے آپ کو شاہ صاحب کی علمی وراثت کا جانشیں گردانتا ہے' بلکہ اسے یہ بھی دعوئی ہے کہ افکار قاسمی دراصل ولی اللہی فکر و حکمت کی بہترین شرح ہیں۔ لیکن شاہ صاحب سے یہ گہری عقیدت' شاہ صاحب کی کتابوں کو نصاب تعلیم میں جگہ نہ دلوا سکی۔ درس نظامی پر برصغیر کے اہل علم (۲۰) نے جو تبصرے کیے ہیں' یا اس پر نظر ثانی کرنے کے لیے جو تجاویز پیش ہوتی رہی ہیں' ان کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ ان افکار و آراء کی صدائے بازگشت تھیں' جن کا اظہار جامعہ ازہر کی اصلاح کے سلسلہ میں کیا گیا۔ مثلاً" یہ کہا گیا کہ نصاب تعلیم میں علامہ سعد تفتازانی اور سید میر کی تالیفات فنی نقطہ نظر سے مفید نہیں ہیں۔ مصری علماء کا خیال ہے کہ تیمور لنگ کے عہد میں تفتازانی اور سید میر کو سرکاری طور پر جو عروج حاصل ہوا' تو انہوں نے اپنے استاد عضد الدین' صاحب مواقف کے طریق تدریس اور کتابی علم کو فروغ دیا جس سے علم کو نقصان پہنچا۔ اس بات کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ جب محی الدین محمد سلیمان' جو نحو کی کتاب "الکافیہ" کی کثرت تدریس کی وجہ سے "الکافجی" کے نام سے معروف تھے' مصر میں آئے تو سرکاری سطح پر ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی جس کی وجہ سے علماء ان کے قرب کو ضروری گردانتے۔ کافجی کو الفاظ کی گرہ کشائی اور علوم نقلیہ میں فلسفیانہ اسلوب کی بھونڈی پیروی پر بڑا ناز تھا۔ جلال الدین سیوطی ان سے ملنے گئے تو انہوں نے سیوطی سے کہا کہ "زید قائم" میں ایک سو تیس بحثیں ہیں۔ (۲۱) اس قسم کی ابحاث اور لفظی موشگافیوں میں عمر کا ضیاع تو ہوتا رہا اور قریب

خوردہ شاہیں سراب کو حقیقت جانتا رہا' لیکن نہ تو دینی ذوق پیدا ہوا کہ اصلی سرمایہ حیات ہے اور نہ ہی عربی ذوق' جو قرآن فہمی کا ایک بنیادی سرچشمہ ہے۔ ابوالکلام آزاد نے سچ کہا تھا کہ چند کتابوں کے علم اور نفس علم میں بڑا فرق ہے۔ غرضیکہ یہ نصاب تدریس علمائے مصر کی نظر میں عربی ذوق کو بگاڑنے کا موجب بنا۔ کہتے ہیں کہ جب اموی خلیفہ یزید بن ولید نے خلیفہ بننے کا اعلان کیا' تو اسے پتہ چلا کہ مروان بن محمد نے اس کی بیعت نہیں کی ہے' اور وہ اس بارے میں تردد و تذبذب کا شکار ہے' اس لیے کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ اس پر یزید نے مروان کو لکھا: میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں ہماری بیعت پر تردد ہے۔ جب تمہیں میرا یہ خط ملے تو تم جو بھی قدم اٹھانا چاہو' اٹھاؤ۔ والسلام

یزید بن ولید نے مروان کی اس ذہنی کیفیت کو کہ وہ بیعت کے بارے میں تذبذب کا شکار تھا اور کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا تھا' عربی کی عبارت "تقدم رجلا وتوخر اخری" سے تعبیر کیا جس کا لفظی ترجمہ ہے "تم ایک قدم آگے بڑھاتے ہو تو دوسرا پیچھے"۔ خطیب قزوینی نے اسے تلخیص میں نقل کرنے کے بعد اس کی شرح میں جو بے مقصد اور مہمل موشگافیاں کی ہیں' اس پر عبد المتعال صعیدی نے لکھا ہے کہ چونکہ وہ عبد القاہر کی بجائے سکاکی' سعد (تفتازانی) اور سید میر (جرجانی) سے متاثر تھا' اس لیے عربی ذوق سے محروم رہا۔ چنانچہ وہ عربی کے اس صاف اور واضح اسلوب کو سمجھ نہ سکا اور اس بات پر وقت ضائع کیا کہ مروان واقعی ایک قدم آگے اٹھاتا تھا' کیا اسی قدم کو پیچھے لے جاتا تھا اور اس قسم کی سقیم اور بے معنی تشریحات کی ہیں۔ (۲۲)

غرض جامعہ ازہر میں صلاح کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ گزشتہ صدی کے آخر میں شیخ الازہر شیخ انبابی نے ایک فتوئی میں کہا کہ علوم ریاضی کی' جیسے حساب' ہندسہ' طبعیات وغیرہ' تعلیم جائز ہے۔ اگر کسی علم کے پڑھنے پر کوئی دنیاوی یا دینی مصلحت موقوف ہو' تو پھر اس علم کا پڑھنا واجب ہے۔ مثلاً" علم طب۔ شیخ انبابی نے اپنے فتوئی میں امام غزالی کا سہارا لیا کہ انہوں نے احیاء علوم الدین میں ان علوم کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن جب شیخ محمد عبدہ نے انبابی سے مقدمہ ابن خلدون کو داخل نصاب کرنے کے لیے کہا تو انبابی نے جواب دیا کہ ایسا کرنا ہماری روایت کے خلاف ہوگا۔ (۲۳)

جامع ازہر کی اصلاح کے لیے شیخ عبدہ نے اپنی رپورٹ لکھی' جس پر انہیں وقت کے علمائے جامد کا ہدف ملام بننا پڑا۔ لیکن عبدہ کا علمی مقام' عربی زبان پر گہرا رسوخ اور ہجوم مشکلات میں ان کا صبر و استقلال' بالاخر وقتی شورشوں اور معاندانہ ہنگاموں پر غالب آیا اور

جہل و تعصب کو فکر و نظر کے لیے اپنی جگہ چھوڑنی پڑی۔ جامعہ ازہر میں ان اصلاحات سے پہلے ازہر پر ایک عام علمی و اخلاقی انحطاط طاری تھا' جس کے خلاف آواز اٹھانا' گویا دین کے خلاف آواز اٹھانا تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن مصر میں جمال الدین افغانی کی آمد نے افکار میں آگ لگا دی اور اس کی مسیحا نفسی نے شیوخ کے غرور نفس اور جمود طبع کو توڑ دیا اور محمد عبدہ جیسے آدمی کو اصلاح کے لیے کھڑا کیا' ورنہ جامع ازہر کی علمی و فکری ابتری' مسلمانوں کے عام انحطاط و زوال کی علامت تھی۔ مولانا شبلی کو' جو گزشتہ صدی کے آخر میں مشرق وسطیٰ کے ملکوں کی سیر کرتے ہوئے مصر پہنچے تھے' جامع ازہر کی اخلاقی ویرانی اور علمی ابتری دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ اور انہوں نے نہایت ہی رنج و الم سے اس کا تذکرہ اپنے سفر نامہ روم میں کیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دارالعلوم کے نصاب تعلیم کو بہتر' موثر اور ٹھوس بنانے کے لیے خود دارالعلوم کے فاضل حضرات ہی ایک مدت سے سوچ بچار کر رہے ہیں۔ مولانا گیلانی کی یہ رائے یقیناً غور طلب ہے کہ مسلمانوں کو نصاب تعلیم میں اپنی تاریخی وحدت کو واپس لانا چاہیے۔ دین اور دنیا کی تفریق نے مسٹر اور ملا کا جو جھگڑا پیدا کیا ہے' اس سے نجات حاصل کرنا ازبس ضروری ہے۔ مولانا ایک جگہ فرماتے ہیں: "دینیات کی کل تین کتابوں (مشکوٰۃ' ہدایہ' وقایہ) کے سوا ملائیت کا سارا میدان غیر دینیاتی کتابوں سے بھرا ہوا محسوس ہوا' تو حقیقت یہ ہے کہ اسی وقت سے میں اپنے اندر اس یقین کو پاتا ہوں کہ اسی میدان کو قدیم مطالبے والے غیر دینی علوم کو نکال کر باآسانی موجودہ مطالبوں کے مطابق مضامین کے لیے پوری قوت اور کافی وسعت دلی کے ساتھ ہم جگہ نکال سکتے ہیں۔" (۲۴) خود دارالعلوم کے اندر "مولانا حسین احمد مدنیؒ کے آخری زمانے میں پھر نصاب پر نظر ثانی کی تحریک شروع ہوئی اور دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے باضابطہ ایک کمیٹی کی اس مقصد کے لیے تشکیل کی۔ اس کمیٹی نے نصاب میں ترمیمات کیں اور قدیم علوم عقلیہ کو کم کر کے انگریزی اور علوم جدیدہ کو اس میں شامل کرنے کی سفارش کی مگر بعض وجوہ سے حضرت (مدنی) رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی میں اس کمیٹی کی سفارشات پر عمل نہ ہو سکا۔ تاہم اس کی ضرورت برابر محسوس کی جاتی رہی۔" (۲۵)

مقام مسرت ہے کہ دارالعلوم کے فاضل حضرات کو نہ صرف وقت کے تقاضوں کا احساس ہے بلکہ وہ اپنے حالیہ نصاب تعلیم کے نتائج سے بھی خوش نہیں ہیں۔ قاضی زین العابدین سجاد اس افسوس ناک صورت حال کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اکثر حالات میں نہ طلبہ (عربی مدارس) عربی زبان سے واقف ہوتے ہیں، نہ دینی مسائل سے، نہ قرآن کا ترجمہ کر سکتے ہیں، نہ حدیث کو سمجھ سکتے ہیں مگر ان کو ایک طویل وعریض سند حوالے کر دی جاتی ہے، جسے بعض حالات میں وہ پڑھ کر بھی نہیں سنا سکتے اور وہ بھی مرکزی دینی مدارس کے اکابر علماء کے دست مبارک سے۔" (۲۶)

قاضی صاحب موصوف نے تعلیمی انحطاط پر جو تبصرہ کیا ہے، تقریباً" یہی بات دارالعلوم کے ایک دوسرے بزرگ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے کہی ہے۔ فرماتے ہیں:

"علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے جو کتابیں اور جس ترتیب سے رکھی گئی ہیں، وہ مقصد کے حصول کے لیے کافی نہیں ہیں۔ پھر ان کا جو طریق تعلیم ہے، وہ بھی ناقص ہے۔ طالب علم کا واسطہ کتاب سے رہتا ہے، فن سے نہیں۔ علوم آلیہ میں (صرف، نحو، معانی، بیان و بلاغت وغیرہ) اس سلسلہ میں دو قسم کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ایک طریق تعلیم میں اور دوسری کتب درسیہ میں۔ اول الذکر میں اس لیے کہ ہمارے طلبہ عربی ادب میں مقامات، سبعہ معلقہ اور دیوان متنبی وغیرہ پڑھ جانے کے باوجود عربی زبان میں نہ لکھ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں۔ اب رہیں کتب درسیہ، تو ظاہر ہے کہ عربی ادب میں اب بہتر سے بہتر کتابیں یا ان کے منتخبات چھپ کر آگئے ہیں۔"

غرضیکہ اس صدی کے آغاز میں درس نظامی پر نظر ثانی کے لیے جو باتیں شبلی، ابوالکلام آزاد اور دوسرے علماء نے کہی تھیں، اب انہیں تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں اس سلسلہ میں مولانا آزاد نے ایک کمیٹی بنائی تھی، جس میں مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن، ڈاکٹر عبد العلیم، مولانا سید سلیمان ندوی اور ایک شیعہ عالم شریک تھے۔ اس کمیٹی نے بھی جدید نصاب تیار کیا تھا جس میں مسلمانوں کی تعلیمی، اقتصادی اور فلسفیانہ کاوشوں کے ساتھ دور حاضر کا فلسفہ بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ درس نظامی میں اصلاح یا دوہرے نظام تعلیم کو ختم کرنے کے لیے اب تک جو مساعی کی گئی ہیں، ان سب میں یہ نصاب ٹھوس، مربوط اور جامع تھا۔ اس نصاب کو وقت کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ (۲۷) خود ابوالکلام نے ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ کانفرنس میں (جس میں علماء اور ماہرین تعلیم شریک تھے) اپنی ایک معروف تقریر میں درس نظامی پر تبصرہ کرتے ہوئے ہر فن اور اس کی کتابوں کا جائزہ لیا تھا، جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے نصاب تعلیم اور جامع ازہر کے اصلاحی پروگرام کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اپنی تقریر کے آخر میں فرماتے ہیں:

"افسوس! درس نظامی ہماری ضروریات کی ہرگز کفایت نہیں کرتا۔ ہم معقولات کی تعلیم میں ساری دنیا سے ڈیڑھ سو برس پیچھے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اس ورثہ کو محفوظ رکھیں اور اس کی عظمت کو قائم رکھیں لیکن ہمیں زمانہ کی رفتار کو پیش نظر رکھنا ہی پڑے گا۔

زمانہ سے قدامت پسندی ہمیشہ لڑتی رہی ہے۔ قدامت پرستی نے جب ہتھیار اٹھایا تو کشمکش ضرور ہوئی' مگر قدامت پسندی ہاری اور وقت جیتا۔ ہم وقت سے نہیں لڑسکتے۔ آپ کہیں گے کہ پہلے بھی تو لوگ یہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ سچ ہے لیکن اس وقت زمانہ ۱۹۴۷ء کا نہیں تھا' اس وقت تعلیم و زمانہ میں رشتہ تھا۔ اس کے بعد زمانہ پوری رفتاری سے چلتا رہا اور ہم بیٹھے رہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ آپ نصاب تعلیم کی ازسرنو تشکیل کریں اور زمانہ کے رخ کو پہچان کر آگے بڑھیں۔"

یہاں پر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ درس نظامی پر نظرثانی کا یہ مقصد نہیں ہے کہ دینیات کے طلبہ نیچرل سائنس میں مثلاً" طبعیات' کیمسٹری' انجینئرنگ' علم طب' ماہر بن کر نکلیں۔ قدیم نصاب تعلیم پر نظرثانی کا مفہوم یہ ہے کہ طالب علم اپنے ہی فن میں ماہر بنے اور اسے علم ہو کہ اس کے فن میں یعنی مذہب' علم کلام' تاریخ اور فلسفہ میں انسانی فکر نے انسان کے لیے کیا سرمایہ فراہم کر دیا ہے۔ نیز یہ کہ عربی زبان پر عبور حاصل ہو۔ اگر صرف' نحو یا ادب میں ایسی کتابیں موجود ہیں' جو مروجہ نصابی کتابوں سے زیادہ مفید ہیں اور تجربہ نے ان کی افادیت کی تصدیق بھی کر دی ہے' تو پھر ان کتابوں کو داخل نصاب کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ یہی بات طریق تعلیم کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ ایسے ہی اگر ہمارے اسلاف نے اپنے زمانہ کے مغربی علوم (یونانی فکر) کو اپنے نصاب کا حصہ بنایا تھا' تو آج بھی مغربی علوم کو (فلسفہ' تاریخ' سیاست' علم دینیات) نصاب کا حصہ بنایا جا سکتا ہے' تاکہ ہمارا طالب علم تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے موضوع پر پورے اعتماد اور وثوق سے بات چیت کر سکے اور دوسروں تک پیغام پہنچا سکے۔ اس لیے ہماری یہ رائے ہے کہ اگر دارالعلوم اپنے ابتدائی اور ثانوی نصاب میں جدید سرکاری مدارس کے مضامین کو بھی جذب کر لے' تو اس کے طالب علم کالجوں میں داخلہ لے سکتے ہیں اور یہ طالب علم آگے چل کر اپنی دینی اور مذہبی تعلیم و تربیت کی وجہ سے امتیازی شان کے مالک ہوں گے۔ لیکن جو طلبہ دینیات ہی میں اعلیٰ تعلیم جاری رکھنا چاہیں تو ان کے لیے دارالعلوم اپنے نصاب میں فلسفہ' سیاست' معاشیات اور تاریخ کے جدید ابحاث کو بھی شامل کر لے۔ برطانیہ اور امریکہ

کی معروف دانش گاہوں میں دینیات کے مستقل ادارے قائم ہیں، جن میں علم کلام، بائبل کی تفسیر و تشریح، عیسائی مجددین کی تاریخ، غرضیکہ فلسفہ مذہب کے تمام پہلو، پوری قوت اور دیدہ ریزی سے پڑھائے جاتے ہیں۔ یہی طالب علم آگے چل کر دنیا میں کلیسا کی عظیم الشان منظم تحریک کو نیا خون فراہم کرتے ہیں۔ شبلی مرحوم نے ایک دفعہ ہندوؤں کے مذہبی مدارس گروکل کے بارے میں کہا تھا کہ ان مدارس میں استاد اور طالب علم دونوں انتہائی محنت، ریاضت اور عزم سے کام کر رہے ہیں اور اپنے نصاب میں نہ صرف انگریزی زبان بلکہ اسلام کو بھی رکھا ہے۔ دار العلوم نے، جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، بعض کمیٹیاں بھی بنائیں جو بہ وجوہ اپنے کام کو آگے نہ بڑھا سکیں۔ اس لیے اگر وہ از سر نو ماہرین تعلیم کی کمیٹی کی تشکیل کرے، جو اس موضوع پر مبسوط، مربوط اور ٹھوس رپورٹ تیار کرے اور پھر اس رپورٹ کی روشنی میں دار العلوم اپنے ہاں نصاب تعلیم اور طریق تعلیم کے خدوخال متعین کرے تو یہ امر بڑے ہی دور رس خوشگوار نتائج پر منتج ہو گا اور اس طریق سے وہ حاجی سید محمد عابد، مولانا محمد قاسم اور ان کے ساتھیوں کی مقدس تمناؤں کی صحیح ترجمانی کر سکے گا۔

ماخذ اور حواشی

۱۔ دیوبند اسکول اور مطالبہ پاکستان، کتاب دراصل فاضل مولف کا ایک تحقیقی مقالہ ہے جسے انہوں نے میگل یونیورسٹی کے لیے لکھا تھا۔ نیز ملاحظہ ہو: مولانا محمد طیب صاحب" دار العلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی۔ مولانا سید محمد میاں: علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے ج ا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، سوانح مولانا محمد قاسم نانوتوی، ہر چند کتاب کا موضوع مولانا نانوتوی کی ذات گرامی ہے لیکن دار العلوم کی بنیاد، نصاب تعلیم اور دوسرے مسائل بھی زیر بحث آ گئے ہیں۔ سید محبوب رضوی : تاریخ دار العلوم دیوبند (مقدمہ از قاری محمد طیب) باربرا مٹکاف: برطانوی ہند میں اسلام کی احیاء: دیوبند، طبع پرنسٹن یونیورسٹی امریکہ، ۱۹۸۲ء

۲۔ آئین اکبری، ج ا، ص ۵۲۴ (کلکتہ ایڈیشن) ابو الفضل کے الفاظ یہ ہیں: قلعہ از خشت پختہ دارد۔ نیز ملاحظہ ہو گزیٹر، سہارن پور، ج ۲، ص ۲۲۴۔ سید محبوب رضوی: تاریخ دیوبند

۳۔ محمد نذیر احمد: تذکرۃ العابدین، امداد العارفین ص ۶۸

۴۔ ایضاً " : " ۶۸، ۶۹

۵۔ محمد طیب: دار العلوم دیوبند، ص ۱۷، ۱۸
۶۔ ندوۃ العلماء، رپورٹ ۱۹۱۲ء، ص ۱۰۹، ۱۱۰
۷۔ روئداد مدرسہ دیوبند ۱۲۹۲ھ بحوالہ سوانح قاسمی، ج ۲، ص ۳۲۵۔ تاریخ دیوبند ص ۳۷۷
۸۔ اشرف علی تھانوی، مولانا: حکایت اولیاء (ارواح ثلاثہ) ص ۲۳۰۔ یہ روایت مرحوم قاری محمد طیب نے اپنے والد مرحوم کے حوالہ سے بیان کی ہے لیکن مولانا تھانوی نے حاشیہ پر تذکرۃ العابدین کی روایت نقل کر دی ہے کہ معذرت حاجی عابد حسین نے نہیں بلکہ مولانا محمد قاسم نے پیش کی تھی۔
۹۔ علمائے حق ج ۱، ص ۶۷، ۶۸
۱۰۔ تذکرۃ العابدین ص ۷۳
۱۱۔ برہان، دہلی، نومبر ۱۹۶۳ء (شاہ ولی اللہ اور شاہ عبد العزیز سے متعلق چند غلط روایات، از محمد عضد الدین خان)
۱۲۔ عزیز الرحمان (مفتی) تذکرہ مشائخ دیوبند ص ۱۶۸
۱۳۔ سوانح قاسمی ج ۱، ص ۲۸۱
۱۴۔ مرحوم نواب حبیب الرحمان شروانی نے اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ لکھا ہے کہ ندوۃ العلماء کے ایک اجلاس میں درس نظامی سے منطق کے رسالہ ایساغوجی کو خارج کرنے کی تجویز پیش کی گئی تو "اس مسئلہ پر (بہ قول شروانی صاحب) تین دن بحث ہوتی رہی، علماء کی اکثریت یہ کہہ رہی تھی کہ اگر "ایساغوجی" کو نصاب سے خارج کیا گیا تو اس سے علم کی بنیاد ہی اکھڑ جائے گی" (سوانح قاسمی ۲ ر ۲۹۹۔ حاشیہ)
۱۵۔ سوانح قاسمی، ج ۲، ص ۲۹۳، ۲۹۴
۱۶۔ دار العلوم دیوبند، ص ۳۹۔ لیکن تاریخ دار العلوم میں اسی سند کو "الفاضل" کا نام دیا گیا ہے، ملاحظہ ہو ج ۲، ص ۲۷۵، ۳۰۱
۱۷۔ دار العلوم دیوبند ص ۳۵، ۳۹۔ تاریخ دار العلوم دیوبند، ج ۲، ص ۲۷۰، ۲۷۴۔ دار العلوم دیوبند (از ظفیر الدین) ص ۱۳، ۱۶۔ مقام مسرت ہے کہ نصاب میں بعض نئی مفید کتابیں بھی شامل کر لی گئی ہیں مثلا سال دوئم میں نحو کی کتاب "النحو الواضح" سال سوئم میں تاریخ ہند، تاریخ اسلام، فن بلاغت میں البلاغۃ الواضحۃ،

عربی ادب میں برائے مطالعہ احمد امین کی "حیاتی" طٰہ حسین کی "الایام" عباس محمود عقاد کی "عبقریات" مقدمہ ابن خلدون جیسی کتابیں رکھ دی گئی ہیں جن پر ہم دار العلوم کے ارباب حل وعقد کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

۱۸۔ دیوبند اسکول، ص ۳۲، ۳۳

۱۹۔ التفہیمات الالٰہیۃ، ص ۲۹۵ (تحقیق غلام مصطفیٰ قاسمی) پروفیسر محمد سرور نے بھی ارمغان شاہ ولی اللہ میں اس وصیت نامہ کو نقل کیا ہے۔

۲۰۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ شبلی نعمانی (رحمہ اللہ) کو درس نظامی اور اسلام کے کلاسیکی ادب پر عبور حاصل تھا۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے ایک ماہر فن کی حیثیت سے لکھا، درس نظامی کے بارے میں مولانا رحمہ اللہ لکھتے ہیں: یہ امر خاص طور پر اظہار کے قابل ہے کہ آج جس چیز کو لوگ درس نظامی کہتے ہیں اور اس نام کی وجہ سے سختی کے ساتھ اس پر اڑے ہوئے ہیں، اس کا بڑا حصہ درس نظامی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا مثلاً حمد اللہ، ملا حسن آج درس نظامی میں داخل ہیں، یہ کتابیں ملا نظام الدین کے زمانہ میں تصنیف بھی نہیں ہوئی تھیں، قاضی مبارک درس میں داخل نہ تھی۔ ...... متعدد کتابیں جو اس وقت درس میں داخل تھیں، وہ اب اڑا دی گئیں ...... اسی طرح انہوں (ملا نظام الدینؒ) نے فن موسیقی کو بھی داخل درس رکھا ہے۔

۲۱۔ تاریخ الاصلاح فی الازہر، ص ۲۴۶، ۲۴۷

۲۲۔ ایضاً" ص ۲۷۲، ۲۷۳

۲۳۔ ایضاً ص ۴۳

۲۴۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص ۳۲۳، ۳۲۴

۲۵۔ زین العابدین سجادؒ: "ہندوستان کے عربی مدارس اور ان کے نصاب تعلیم پر ایک نظر" در مجلہ "اسلام اور عصر جدید" دہلی، جنوری ۱۹۷۰ء، ص ۴۱۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۹۲۸ء میں دار العلوم نے اعلان کیا تھا کہ فلسفہ کی جدید کتابوں کو داخل درس کیا جائے گا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ملاحظہ ہو "القاسم" دار العلوم نمبر، دیوبند، محرم ۱۳۴۷ھ، ص ۴

۲۶۔ اسلام اور عصر جدید، جنوری ۱۹۷۰ء، ص ۴۴

۲۷۔ عابد رضا بیدار نے "ہندوستانی مسلمانوں کی ریفارم کے مسائل" میں لکھا ہے کہ اس مجوزہ نصاب کا ایک نسخہ رام پور لائبریری میں محفوظ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ

مولانا مرحوم اپنی علمی اور سیاسی مصروفیتوں کے باوجود مسلمانوں کے قدیم نظام تعلیم پر برابر غور و فکر کرتے رہے۔ انہوں نے "تذکرہ" میں کھل کر درس نظامی پر تنقید کی' لیکن اس کے ساتھ ساتھ ۱۹۲۶ء میں جدید نصاب کی تدوین بھی کی اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا جائزہ بھی لیا۔ ہمارے علماء کرام اور ماہرین تعلیم کو ان دونوں رپورٹوں کا (رپورٹ ۱۹۲۶ء جو کلکتہ کے شعبہ تعلیم میں شاید محفوظ ہو' جیسا کہ مرحوم غلام رسول مہر نے "تبرکات آزاد" میں لکھا ہے اور رام پور لائبریری میں محفوظ رپورٹ ۱۹۴۷ء) جائزہ لینا چاہئے۔

(بہ شکریہ "المعارف" لاہور)

مذہب کے مطالعہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ آپ اس کی تاریخ' اس کی شخصیات' اس کے احکام اور اس کے رسوم و رواج کا مطالعہ کریں۔ یہ گویا اشیاء مذہب کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس پہلو سے مذہب میں بھی موضوعی معلومات دستیاب ہیں۔ اس لیے یہاں مذہب کا مطالعہ بھی ٹھیک اسی طرح براہ راست شواہد کی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے جس طرح حیاتیاتی ارتقاء میں کیا جاتا ہے۔

مذہب کے مطالعہ کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو عام طور پر غیبیات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ عقائد ہیں جو ہماری محسوس دنیا سے ماورا ہیں۔ یعنی خدا اور فرشتوں کا وجود' وحی کی حقیقت' جنت اور دوزخ کا عقیدہ وغیرہ۔ مذہب کے اس دوسرے پہلو میں براہ راست شواہد موجود نہیں ہیں۔ اس لیے اس اعتبار سے مذہب کا مطالعہ اس منطقی اصول کی روشنی میں کیا جائے گا جس کو شواہد کی بنیاد پر استنباط کہا جاتا ہے۔ اس تجزیہ کی روشنی میں دیکھئے تو مذہب اور سائنس دونوں کا معاملہ بالکل یکساں ہے۔ دونوں ہی میں دو الگ الگ حصے ہیں۔ ایک حصہ وہ ہے جو علمی قطعیت پر قائم ہے اور جس میں براہ راست استدلال ممکن ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ وہ جو علمی استنباط پر مبنی ہے اور جس کو ثابت کرنے کے لیے صرف بالواسطہ استدلال کا اصول استعمال کیا جاتا ہے۔ اس علمی تقسیم کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔

(مولانا وحید الدین خان)

مولانا سید محمد رابع ندوی - ناظم ندوۃ العلماء - لکھنؤ

دینی مدارس اور ان کا نصاب

مدارس عربیہ کا نصاب در اصل مسلمانوں کی گزشتہ صدیوں میں رائج نصاب درس سے ماخوذ رہا ہے۔ یہ قدیم نصاب اگرچہ گزشتہ صدیوں میں حالات اور تقاضوں کے مطابق بدلتا رہا تھا اور مضامین کے سلسلہ میں کمی وبیشی کا عمل جاری رہا تھا لیکن معقولات کی جو اہمیت چوتھی پانچویں صدی ہجری سے عالم اسلام کے علمی حلقوں میں پیدا ہو گئی تھی، وہ اس میں جاری رہی۔ اس کے اثر سے ذہنوں میں بحث وجدل کا مزاج بنتا تھا اور عملی اور تجربی علوم کی رغبت کم ہوتی تھی۔ نیز علوم دینیہ کی بھی جو کتابیں تصنیف ہوئیں، ان کا طرز بیان معقولات سے متاثر رہا۔

برصغیر میں بھی گزشتہ صدیوں میں یہی طرز غالب رہا۔ اخیر میں درس نظامی کے نام سے جو نصاب رائج ہوا، وہ اصلاً ملا نظام الدین فرنگی محلی کا اختیار کردہ تھا اور اس میں معقولات کو وسیع مقام دیا گیا تھا۔ اس میں علوم دینیہ میں حدیث کو بھی وہ وسعت حاصل نہیں تھی جو اس کے لائق ومناسب تھی لیکن اس کمی کو متعدد علماء حق نے محسوس کیا جن میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ دہلوی کی توجہ کا بڑا حصہ تھا، چنانچہ علماء حق کی اس توجہ سے صحاح ستہ کی تعلیم کو خاصی اہمیت حاصل ہوئی اور نتیجتاً ان کو بالاستیعاب ایک سال میں پڑھا دینے کا سلسلہ شروع ہوا جو تمام مدارس دینیہ میں رائج ہو گیا۔

مذکورہ بالا گزشتہ عہد پوری اسلامی دنیا کے لیے سخت انحطاط اور علمی لحاظ سے جمود کا زمانہ تھا، مغربی قومیں ترقی کر رہی تھیں اور مشرقی قوموں پر غالب آتی جا رہی تھیں، مسلمانوں نے مفید اور تقاضائے وقت کے مطابق اپنے کو تیار کرنے اور ضرورت کے علوم ومعارف سے واقف ہونے کی طرف توجہ ختم کر دی تھی اور نصاب درس کے معاملہ میں بھی کسی بڑی تبدیلی کے لیے اپنے کو تیار نہیں کر پا رہے تھے۔ ایسے میں مغربی قوموں کے غلبہ نے اور بھی خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ ہندوستان میں مغلوں کا چراغ ٹمٹمانے لگا تھا، اور ضرورت تھی کہ مسلمانوں کی زندگی کو مختلف میدانوں میں ابھرنے اور اپنی صفیں مضبوط کرنے کا موقع ملے۔ اس کے لیے تعلیم بہت بڑا عامل تھا جس کو درست کرنے اور وقت کے مطابق بنانے

کی ضرورت تھی لیکن وہ جمود اور محدودیت کا شکار تھی۔

لیکن پھر بھی مغلیہ سلطنت کے کمزور ہونے کے سبب سے مسلمانوں کی اسلامی زندگی کو عقائدی اور اخلاقی سطح پر جو زبردست چیلنج کا سامنا کرنا پڑنے لگا تھا' اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اس وقت کے علماء و مصلحین نے جن میں خاص طور سے شاہ ولی اللہ ؒ اور ان کے خاندان کے ذی علم افراد تھے' خاص توجہ صرف کی اور اس جدوجہد کو اس وقت کی جو علمی و تعلیمی بنیاد درکار تھی' وہ مہیا کی۔ ان کی کوشش سے علم و تعلیم سے جو دلچسپی بڑھی' اسی سے موجودہ دینی مدارس کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کے لیے اس وقت جو نصاب تعلیم اپنایا گیا' اس میں کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کی صحیح اور موثر تعلیم' مسلمانوں کے زوال پذیر معاشرہ کو اسلامی بنانے کی ضرورت کے لائق مضامین وکتب نیز عقائد صحیحہ کو غلط اور گمراہ طریقے سے پیش کرنے والوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے والے علوم بھی شامل کیے گئے' ان کے اور علوم شرعیہ کے ساتھ حسب سابق علوم عقلیہ و آلیہ کو بھی شامل نصاب رکھا گیا' اس نصاب کو تقویت ورواج زیادہ تر دار العلوم دیوبند میں اس پر عمل کیے جانے سے ہوا۔ دار العلوم دیوبند جس کو اپنے وقت کے عظیم عالم دین مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے پروان چڑھایا اور ان کے رفقاء کے تعاون سے اس کو عظمت وشہرت حاصل ہوئی' وہ سب حضرات اپنے وقت کے شیوخ اور بزرگ تھے۔ مولانا رشید احمدؒ گنگوہی' شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ دیوبندی اور ان کے بعد کے بزرگ علماء مولانا حسین احمدؒ مدنی' مولانا شبیر احمدؒ عثمانی' مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب قاسمی وہ بزرگ علماء تھے کہ جن کے کام اور اقدام میں اثر وبرکت تھی۔ وہ کسی معمولی سے معمولی نصاب کو چلاتے تو اس سے بھی موثر نتائج نکلتے کیونکہ ان کی بات میں اثر تھا' ان کی ہدایت ونصیحت میں اثر تھا' ان کی تعلیم وتربیت میں اثر تھا۔ ان کے اثر سے اسی دار العلوم دیوبند کو دور دور تک شہرت ہوئی اور وہاں آنے والے طلباء درس گاہ کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ وہاں کے ان عالی قدر مدرسین سے ہمت وقوت وجذبہ حاصل کرتے رہے جو ان کی عملی زندگی میں دوسروں کے فیض کا بھی باعث بنا رہا لیکن جہاں تک نصاب کا تعلق تھا' اس میں وقت اور حالات کے لحاظ سے جو کمی پائی جاتی تھی' اس کو دور کرنے سے وہ نصاب اور زیادہ مفید اور ملت کی ضرورت کو پورا کرنے والا بن جاتا جس کو تقریباً محسوس نہیں کیا گیا۔

حالانکہ تفسیر وحدیث وفقہ جو علوم عالیہ کے عنوان میں داخل تھے' ان میں تغیر وتبدل کی ضرورت نہ تھی البتہ علوم آلیہ نحو وصرف وادب کی تعلیم میں نئے تجربوں میں آئے

ہوئے طریقوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا اور علوم عقلیہ کی مقدار میں فرق کر کے ملت کی ضرورت کے علمی و اجتماعی پہلوؤں سے تعلق رکھنے والے مضامین کا ضروری حصہ داخل کیا جا سکتا تھا لیکن بزرگوں کی برکت سے جو نفع حاصل ہو رہا تھا' اس کی روشنی میں مذکورہ بالا ضرورت کو ٹھیک سے محسوس نہیں کیا جا سکا اور اسی نصاب کو برابر قائم رکھا گیا۔ اس کے اثر سے نصاب تعلیم کے یہ مشمولات تقریباً" تمام مدارس اسلامیہ دینیہ میں رائج رہے' اس نصاب میں زیادہ اور تفصیلی طریقہ سے زور صرف چار موضوعات پر دیا گیا۔ ایک حدیث' دوسرے فقہ' تیسرے تفسیر اور چوتھے معقولات و قواعد عربی۔ پورا نصاب تقریباً" ان ہی چار موضوعات پر مشتمل رکھا گیا' اس نصاب کو پڑھ کر انہی علوم میں جید علماء پیدا ہوئے جنہوں نے اسلامی عقائد کی ترویج کی اور مسلمانوں کی زندگی اصلاح کی اور گمراہ کرنے والے لوگوں کی کوششوں کا مقابلہ کیا اور ان کا ابطال کیا۔ آج ملک میں عقائد صحیحہ کے بقاء اور صحیح مذہبی زندگی کے رواج میں ان اسلاف کی ان کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ یہ وقت جبکہ ملک میں انگریزوں کا عمل دخل بڑھ رہا تھا اور ان کی حکومت سے مسلمانوں کے لیے بڑے خطرات محسوس کیے جانے لگے تھے' اسلام وملت اسلام کے تحفظ کے لیے جو کوششیں جاری تھیں' ان کے لیے بھی خطرات پیدا ہونے لگے۔ یہ بدیسی حکومت مسلمانوں کے ملکوں میں سیاسی سطح پر نہ صرف یہ کہ اپنی قوت کا مظاہرہ کر رہی تھی بلکہ تہذیبی اور علمی طور پر بھی سخت اثر انداز ہو رہی تھی' اس کی تہذیب کا غالب قوم کی تہذیب کی حیثیت سے اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنے سامراجی مقاصد سے ذہنوں کو بدلنے اور اپنی مصلحتوں کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اپنا مخصوص تعلیمی نظام بنایا اور اس کو رائج کیا۔ چونکہ اس تعلیمی نظام سے دنیاوی وجاہت اور ترقی حاصل ہوتی تھی' اس لیے باوجود اس کی مضرتوں کی طرف توجہ دہانی کے مسلمانوں کی نئی نسلوں کے لیے یہ نظام تعلیم قابل قبول بنا گیا' چنانچہ نئی نسلوں کے لوگ اس کی طرف غول در غول جانے لگے۔ اس طرح مسلمانوں میں دو نظام تعلیم جاری ہو گئے۔ ایک کا محور خالص علم دین تھا' دوسرے کا محور خالص دنیا۔ یہ دو دھارے بن گئے' دینی تعلیم کا دھارا صرف دینی' اور دنیاوی تعلیم کا دھارا دنیاوی دائرے میں چلنے لگا۔

علمائے اسلاف نے اسلامی زندگی کی حفاظت اور عقائد صحیحہ کی ترویج ودفاع کے لیے اپنے نظام تعلیم میں جو حق رکھا تھا' اس میں اصلاً" گمراہ فرقوں اور علمائے سوء کے مقابلہ کا انتظام تھا چنانچہ اپنے اس تعلیمی نظام سے اس کے لائق علماء تیار کیے جن کی بڑی دینی خدمات ہیں۔ لیکن استعماری طاقت کے اثر سے نئے گمراہ کن فکری رجحانات اور اسلامی ثقافت

ومذہب کو نقصان پہنچانے اور ذہنوں سے ان کے اثرات ختم کرنے کی کوششوں کے مقابلہ کے لیے اس نصاب میں انتظام نہ تھا' مثلاً تمدنی علوم' قوموں کی تاریخ نیز موثر ورائج زبان' سیاست واقتصاد وجدید علوم کا کوئی نظم نہ تھا کہ اس کے ذریعہ دشمن کے تفوق کا مقابلہ کرنے کے اوزار ملتے۔ البتہ اس کمی کو ان میں سے متعدد علماء نے محسوس کیا اور حتی الوسع اس پہلو کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی۔ ان کی اس فکر وتوجہ سے مسلمانوں کے نصاب میں اس کی ضرورت کے لیے جگہ نکالنے کی کوشش شروع ہوئی۔ یہ کوشش ایک دعوت وفکر کی صورت میں ظاہر ہوئی اور ندوۃ العلماء نامی ادارہ کے نام سے اس نے کام شروع کیا۔ یہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء کا زمانہ تھا۔

ان کی تجاویز نصاب میں فکری وثقافتی وانسانی ضرورت کے مضامین اور عہد کے مطابق زبان وادب کی صلاحیت پیدا کرنے والے موضوعات بھی پیش نظر تھے۔ اس دائرے میں عربی زبان کو وسیع اور اہم جگہ دی گئی تھی' تا کہ اس میں ایسی قابلیت پیدا کرنا ممکن ہو جو ملت اسلامیہ کے مختلف علاقوں کے درمیان ربط کا ذریعہ ہے اور علوم اسلامیہ سے گہری واقفیت کا وسیلہ بننے کے ساتھ دعوتی زندگی میں استعمال بھی کی جا سکے کیونکہ عربی زبان اسلام کی بنیادی زبان ہونے کے ساتھ مسلمانوں کی درمیانی واسطہ کی زبان بھی ہے جس پر علماء کو عملی عبور رکھنا ضروری امر ہے۔ ثقافتی وانسانی ضرورت کے موضوعات میں تاریخ رکھی گئی' تاریخ درحقیقت ایک وسیع الاطراف موضوع ہے جس میں قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ' ثقافت وتمدن کی تاریخ' دعوت وفکر اسلامی کی تاریخ' استعماری طاقتوں کی سیاسی قوت اور علمی وفکری غلبہ کی تاریخ' مسلمانوں کے آغاز تمدن وغلبہ کی تاریخ' پھر ان کے زوال وشکست خوردگی کی تاریخ' جس میں ان کے اسباب وپس منظر شامل ہیں۔ تاریخ کے علاوہ علمی وفکری میدان میں اس صلاحیت کا پیدا کرنا جس سے قرآن وحدیث' سیرت طیبہ پر مستشرقین کے شرارت آمیز حملوں کو سمجھنے اور پھر ان کا علمی جواب دینے کے قابل بنایا جا سکے اور ایسے مفکرین ودعاۃ پیدا کیے جا سکیں جو دین کا دفاع ہی نہیں بلکہ علم وتحقیق کی راہ سے حملہ آوروں کو شکست دے سکیں۔ اس کے لیے اپنے مقابل کی زبانوں سے ضروری واقفیت اور استعمال کی قدرت درکار ہوتی ہے۔ اس کے لیے ایک طرف خود اپنے ملک وقوم میں رائج الوقت زبان پھر یورپ کی غالب قوم کی زبان سے واقفیت' جس کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کو فرسودہ اور ازکار رفتہ بلکہ احمقانہ قرار دینے کا عمل جابجا ہو رہا تھا۔ پھر صرف غیر ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی نئی نسل کی اکثریت غالب قوم کی زبان کے ذریعہ متاثر ہو کر ان کے خیالات کو

اپنا رہی تھی۔ اس پر عبور حاصل کر کے مسلمانوں کی نئی نسل کی تعلیم یافتہ اکثریت کو ان منحرف خیالات و معلومات سے بچانے کا کام انجام دیا جا سکتا تھا۔ اس میں ثقافت وادب پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ انگریزی زبان وادب سے واقفیت کی بڑی اہمیت تھی۔ زبان کے علاوہ اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے ضروری علمی معلومات جیسے جغرافیہ اور عمرانی وثقافتی علوم اور دیگر اہم عصری موضوعات بھی ضروری تھے۔ ملک کے بدلتے ہوئے حالات یہ بتا رہے تھے کہ کسی بھی زندہ قوم کے نصاب تعلیم میں ان مذکورہ بالا پہلوؤں کو نظر انداز کرنا قوم کو اس کی باعزت زندگی سے محروم رکھنے کے مساوی ہے اور قوم کو قائدانہ صف کے بجائے پچھلی صف میں تابع بن کر رکھنے کی طرف لے جانے والی بات ہے۔

نصاب کی تشکیل میں وسیع النظری کی ضرورت

نئے عہد کی ترقیات اور جدید علوم کے رواج سے یہ بات حقیقت بن گئی ہے کہ بغیر ان علوم کو جانے ان کے شر کا مقابلہ اور اپنی دینی اور اخلاقی اقدار کا دفاع کرنا دشوار ہے۔ کوئی بھی قوم ہو' اپنے صرف مخصوص علمی دائرے کے اندر محدود رہے گی تو دوسری قوموں اور ان کی ترقیات سے ناواقفیت کی بنا پر نقصان اٹھائے گی۔ مزید یہ کہ دوسری قومیں جن راہوں اور ذریعوں سے ترقی کر کے دوسروں پر غالب آ رہی ہیں' ان سے ناواقفیت پر اس قوم کو نہ صرف خسارہ میں رہنا پڑے گا بلکہ ان غیروں کا دست نگر اور تابع مہمل بننا پڑے گا۔ عالم اسلام کی قوتیں کئی صدیوں سے اس احساس میں مبتلا رہی ہیں اور ابھی کچھ تھوڑی بیداری کے باوجود اس ورطہ سے نہیں نکل سکی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اہل دین' جن کی قیادت و رہنمائی میں وہ جامع اور موثر رہنمائی بنتی ہے جس کے اثر سے مسلم قوم عظمت و قوت کے میدان سر کر سکتی ہے' وہ عظمت و قوت کے حصول کے لیے قدیم اختیار کردہ ذرائع کو مقاصد کا درجہ دینے لگے ہیں اور ذرائع کے معاملہ میں روز افزوں تجربوں سے جو تبدیلی اور بہتری کی صورتیں پیدا ہو رہی ہیں' ان کو اختیار کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ علم وثقافت کے میدان میں اس عہد اخیر میں جو توسع پیدا ہو چکا ہے' اس کو بھی ہمارے اہل دین اپنے نظام تعلیم میں نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے دینی نظام تعلیم کی بقاء وکامیابی کے سلسلہ میں بڑا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہم کو علم وثقافت کی اس وسعت کو سمجھنا اور اس کے ضروری حصہ کو لینا ہوگا۔ اس کے لیے اس وقت علم و ثقافت میں جو وسعت پیدا ہو گئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے نظام درس کے تمام علوم و مضامین کی اصناف طے

کر کے ان میں سے ہر ایک کی ضرورت و اہمیت کے لحاظ سے اس کو نظام تعلیم میں جگہ دینا ہوگی اور ان کی الگ الگ مقدار متعین کرنا ہوگی۔ کسی علم و مضمون کو وسیع اور بنیادی درجہ دینا ہوگا اور کسی کو صرف ضمنی اور متعلق کا درجہ دینا ہوگا۔

اسکول ہوں یا مدارس' یونیورسٹیاں ہوں یا جامعات اسلامیہ' سب کو اپنے مقصد کے مطابق ہی علوم و مضامین درس کی تعیین و ترتیب کا عمل کرنا ہوتا ہے۔ عصری اسکول اور یونیورسٹیاں تعلیمی عمل سے کامیاب اور کارپرداز شہری تیار کرنے کا مقصد رکھتے ہیں۔ وہ ایک کامیاب و کارپرداز شہری کے لیے جن علوم کی جو اہمیت اس کی انفرادی ضرورت کے لیے اور عام قومی و وطنی ضرورت کے لیے ہوتی ہے' اس اہمیت اور ضرورت کی مقدار کے مطابق ان علوم کو اختیار کرتے ہیں اور ان کی تعلیم کا اور ان کی تدریب کا نظم کرتے ہیں۔ اس میں زبان و ادب' سماجی علوم اور سائنسی علوم کی بڑی شاخوں کو لیا جاتا ہے۔ اگر یہ اسکول و کالج اسلام بیزار نہیں ہیں تو سماجی علوم کے اندر مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کو ایک چھوٹا سا حصہ دے دیتے ہیں اور اس کو کافی سمجھتے ہیں اور اگر مذہب بیزار ہیں تو مذہبی تعلیمات کو شامل ہی نہیں کرتے بلکہ ان کو مضر سمجھتے ہیں۔

مذہب پسند اسکول و کالج بھی یورپ سے متاثر ہونے کے باعث مذہبی تعلیمات کے لیے اپنے نظام میں بہت معمولی جگہ نکالتے ہیں' اس سے کسی حد تک مذہبی تعلیمات سے تعارف تو پیدا ہو جاتا ہے لیکن مذہبی تعلیمات سے ضروری واقفیت نہیں ہوتی۔ ان کو بھی اپنے نظام تعلیم کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ استعماری طاقتوں کے چھوڑے ہوئے نظام میں وہ اپنی ضرورت اور خصوصیت کے لحاظ سے ضروری ترمیم بھی ابھی تک نہیں کر سکے۔ اسی وجہ سے اس نظام تعلیم سے تیار ہونے والے لوگ مسلمان شہری کم' مغربی شہری زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر وہ شان و شوکت و عظمت کے حامل مغرب کی عطا کردہ تعلیم کے حامل ہونے کے باعث ایک طرح سے زائد احساس برتری بھی رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ علماء اور اہل دین کو علم و تعلیم کے مسئلہ میں خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے تجربوں کو کم از کم واقفیت کے حصول کے لیے بھی ٹھیک سے معلوم کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ یہ ان کی کمی ہے جس کی طرف ان کو توجہ کرنا چاہیے۔

دوسری طرف ہمارے قدیم نصاب کے دینی مدارس میں جنہوں نے حالات زمانہ کی رعایت کرتے ہوئے اپنے نصاب میں تجدید و توسیع نہیں کی ہے جس کے سبب ان کے فضلا زندگی کے ان شعبوں میں صحیح واقفیت سے محروم رہ جاتے ہیں جس میں واقفیت وقت کے

اہم تقاضوں میں ہے۔

لیکن اس کے باوجود خالص دینی ضرورت اور صرف مذہبی علوم میں واقفیت کے دائرے میں ان کی افادیت غیر معمولی ہے اور ملک میں شریعت اسلامی کی حفاظت و بقاء کا اصل سہرا انہی فضلاء کے سر ہے۔ ان مدارس کے نصاب میں ان کے علوم سے مطابقت رکھنے والے مضامین کا اضافہ تو ضروری ہے لیکن ان کے ساتھ ٹیکنیکل تعلیم کو ملانے کی دعوت دینا بے جوڑ بات ہے۔ پھر ان مدارس کو ان کے محدود دینی دائرے میں رہنے دیا جائے تو کم از کم اس دائرے کی ضرورت کا نظم تو ان کے ذریعہ قائم رہے گا جو بذات خود ایک بہت مفید بات ہے۔ پھر ان مدارس کی تعداد پورے نظام تعلیم میں دو تین فیصد سے زیادہ نہیں ہے' اتنی تعداد سے زیادہ تو علوم عصریہ کے نظام میں ایک ایک صنف میں محدود ہو کر تعلیم حاصل کرنے والوں کی ہے' مگر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ کوئی یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ میڈیکل کالج میں انجینئرنگ بھی سکھائی جائے یا انجینئرنگ کے شعبہ میں میڈیکل سائنس بھی پڑھائی جائے۔ قانون کے شعبہ میں آرٹ کی تعلیم بھی ضرور رکھی جائے۔ اسی صورت میں یہ مطالبہ کہ عربی اور اسلامی مدرسوں میں ٹیکنیکل علوم باقاعدہ پڑھائے جائیں' ایک بے وزن قسم کا مطالبہ ہے۔ البتہ طبعیات کے مبادیات کو ان کے کسی مرحلہ میں شامل کرنے میں حرج نہیں' لیکن ان دینی مدارس میں ان کے بنیادی علم کو کم کر کے جن کا وہاں اختصاص پیدا کیا جا رہا ہو' طبعی علم کو وسیع جگہ دی جانے کی بات کہی جائے تو بغیر غور کے کہی جانے والی بات شمار ہوگی۔ البتہ دوسری طرف مدارس اسلامیہ عربیہ سے جو بات کہنے کی ہے' وہ یہ ہے کہ قوم و ملت کی رہنمائی اور اس کی مذہبی واخلاقی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ان مدارس میں جو آدمی تیار کیے جا رہے ہیں' ان کی ضرورت کے لائق مضامین کا انتخاب اور ان کی تعلیم کا بہتر سے بہتر طریقہ جو خواہ اپنوں کے تجربوں میں آیا ہو خواہ غیروں کے تجربے میں' ان کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ ان سے گریز اپنے نظام کو ناکام بنا دینے کے مترادف ہوگا۔

مدارس اسلامیہ عربیہ کے علوم کے اصناف کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان علوم کی اصناف بھی تین ہیں۔ ایک مذہبی بنیادی علوم کی' دوسرے اسلامی ضرورت کے لسانی وسماجی علوم کی' تیسرے زندگی کے متعلق عام معلومات کی۔ یہ زندگی وہی ہے جس میں علماء دین اور رہبران ملت کو بھی رہنا ہوتا ہے۔ کیا وہ ان کے بارے میں ایک ان پڑھ دیہاتی کی طرح رہنا چاہیں گے؟ اگر ایسا نہیں تو زندگی کی اس ضرورت کے تعلق سے ان کو واقفیت پیدا کرنا ہوگی اور جہاں تک سماجی علوم کا تعلق ہے تو وہ اسلامی تعلق کے لحاظ سے بھی بڑی

اہمیت کے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام اور مسلمانوں کی اسلامی فکر وثقافت کو سائنسی علوم سے نقصان نہیں پہنچتا۔ وہ تو تسلیم شدہ اور مشاہدہ سے ثابت شدہ حقائق ہوتے ہیں جو فطری ہیں۔ وہ کسی مذہب سے متصادم ہوں تو ہوں' اسلام سے کہیں متصادم نہیں ہوتے ہیں۔ اصل نقصان تو سماجی علوم کو مخالفانہ یا معاندانہ انداز میں مرتب کرنے اور پیش کرنے سے ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے جن سے یورپ پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس طرح ادب و زبان سے اچھی واقفیت اور ان پر قدرت بھی ذہنوں کو جتنا متاثر کرتی ہے' دوسری صلاحیتیں مشکل سے اتنا اثر انداز ہوتی ہیں۔ یورپ کی قومیں اور ان کے مشرقی شاگرد علوم و آداب کے میدان میں اس وقت جتنے قابو یافتہ ہیں' وہ کوئی مخفی بات نہیں' پھر یہ مغربی ذہن کے لوگ سماجی علوم کی راہ سے مشرقی ذہنوں کو مسلمانوں کے سرمایہ فکر و ثقافت بلکہ عقائد و مسلمات کے سلسلہ میں جتنا متزلزل کرتے رہے ہیں اور کر رہے' اس نے اسلامی فکر وعقیدہ کے لیے ایک بڑا خطرہ کھڑا کر دیا ہے۔ ان کی اکثریت اس میدان میں بھی ہے اور ذرائع ابلاغ و ادب کے میدان میں بھی ہے اور ان کو ان کی مہارت بھی زیادہ ہے۔ اس صورت حال میں اگر موثر اور طاقت اور ذرائع اختیار نہیں کیے گئے تو بنیادی دینی علوم کی حفاظت اور دفاع بھی زیادہ عرصہ تک نہ کیا جا سکے گا۔ دشمن کو اس کے ہتھیار سے ہی شکست دی جا سکتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہمارے نظام تعلیم میں سماجی علوم کا بھی حصہ شامل کیا جائے۔ اور عصری زندگی سے تعلق رکھنے والی ضروری معلومات بھی خواہ بقدر تعارف ہوں' رکھی جائیں۔ اسی کے ساتھ زبان وادب کو بھی وہ مقام دیا جائے' جس کی ضرورت حالیہ عہد کے لحاظ سے محسوس کی جا رہی ہے۔ مضامین کے اس تنوع وتوسع اور درجہ بندی کے لیے تعلیمی مدت بھی اسی کے مطابق کرنا ہوگی۔ اس کے لیے عصری تعلیم گاہوں کا مرحلہ واری طریقہ اپنانا مناسب ہے۔ جہاں تعلیمی مدت ابتداء سے انتہا تک ۱۶' ۱۷ سال کی ہوتی ہے۔ شروع کے پانچ سال ابتدائی کے' پھر تین سال متوسط کے' پھر دو تین سال ثانوی کے پھر چار سال عالی کے' پھر دو سال اعلیٰ و تخصص کے۔

ابتدائی ومتوسط درجات میں ابتدائی دینیات اور زندگی کے متعلق عام بنیادی معلومات ومضامین پڑھانا موزوں ہے جو ان درجات کے طلباء کی عمر کے مطابق سہل الفہم ہوں۔ پھر ثانوی میں مضامین کچھ محدود کیے جائیں اور بنیادی ضرورت کے مضامین کو زیادہ وقت اور اہمیت دی جائے۔ اپنے اپنے مقصد کے مطابق ان کا تعین ہو۔ پھر عالی میں خالص اپنے مقصد کے ساتھ مخصوص مضامین ہی ہوں۔ مثلاً" علوم دینیہ وسیع اور بنیادی طور پر اور سماجی علوم

تھوڑے اور محدود ضرورت کے لیے۔

جامع دینی تعلیم کا ایک تجربہ۔ ندوۃ العلماء

دراصل موجودہ بدلتی ہوئی دنیا کے پیش نظر ضرورت تھی کہ علوم دینیہ واسلامیہ کی وسعت کا حق ادا کرتے ہوئے وقت کے تقاضا کا خیال رکھا جائے۔ علوم اجتماعی میں متعدد علوم وسیع اور مفید علم بن چکے ہیں جن سے عالمانہ واقفیت کے بغیر نہ تو ان سے پیدا ہونے والے اثرات کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ مشرق پر اس کے جو گوناگوں منفی اثرات پڑ رہے ہیں' ان کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک مسلمان کو اگر اسلام سے نبرد آزما طاقتوں کا مقابلہ کرنا ہے' اور اپنے کو اپنی امت کو ان کے شر سے بچانا ہے تو اس کو ان تمام موضوعات سے کسی نہ کسی حد تک واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔

ندوۃ العلماء کی اصلاح نصاب کی دعوت نے اپنے قیام ۱۸۹۳ء سے ہی وقت کے تقاضا کے مطابق نصاب تعلیم کی تشکیل کی اہمیت کو محسوس کیا تھا اور اس کی دعوت دی تھی۔ اس کے لیے اس نے علوم دینیہ کا پورا حق رکھتے ہوئے ضروری نئے موضوعات کو شامل کرنے کا خاکہ مرتب کیا اور نصاب بنایا' اور کام کی ابتداء کی۔ لیکن اس کو جن وسائل کی ضرورت تھی' وہ اس کو لوگوں کی طرف سے توجہ نہ ملنے اور تعاون کم دیے جانے کی وجہ سے نہ مل سکے۔ چنانچہ رفتار ست رہی اور ضرورت کے تمام گوشے اپنائے نہ جا سکے۔ پھر بھی اس کے اس تجربہ کے بتدریج نتائج سامنے آنے لگے تو اس تجربہ کو قریب سے دیکھنے والوں کو اس مسئلہ پر غور کرنے اور اس کے لحاظ سے قدم اٹھانے کی ضرورت کا احساس بڑھا۔ یہ اگرچہ خاصی تاخیر سے ہوا لیکن پھر یہ ایک خوش آئند عمل کہا جانے کا مستحق ہے۔

ندوۃ العلماء نے اپنے نصاب کے مضامین کو تین خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک علوم دینیہ' جو اس کے نصاب کا غالب حصہ ہیں۔ دوسرے لسانی مضامین جن کو وقت اور ضرورت کے لحاظ سے قدیم اور جدید دونوں پہلوؤں سے اپنایا گیا ہے۔ تیسرے علوم اجتماعیہ' جو اسلام اور ملت اسلام کے تعلق سے ضروری ہیں۔ ان تینوں اقسام میں زیادہ توجہ علوم دینیہ پر' پھر لسانیات پر' پھر علوم اجتماعیہ پر دی گئی ہے۔ علوم دینیہ کے دائرے میں قدیم مدارس عربیہ کے نصاب سے تقریباً" پوری یکسانی ہے۔ اس کے مروجہ نصاب میں کتر بیونت نہیں کی گئی۔ البتہ ان کو زیادہ وسیع مدت میں پھیلایا گیا ہے تاکہ وہ پورے ہو سکیں اور ان کا حق زیادہ بہتر طریقہ سے ادا ہو سکے۔ چنانچہ کتب حدیث و فقہ اسی مقدار میں اور تقریباً" انہی کتب کی صورت میں شامل نصاب ہیں جو مروجہ درس نظامی کے نصاب میں داخل ہیں۔

درس نظامی کے دورۂ حدیث کی کتب کو ایک سال کے بجائے تین سالوں میں پھیلایا گیا ہے۔ اس سے قبل مشکوٰۃ شریف دو سال میں رکھی گئی ہے۔ پھر تین سال میں کتب صحاح رکھی گئی ہیں۔ فقہ میں مروجہ کتب کے ساتھ فقہ علی المذاہب الاربعہ سے بھی متعارف کرایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ مسائل حاضرہ کا تعارف بھی رکھا گیا ہے۔ تفسیر متن قرآن اور بیضاوی (بقرہ) پانچ سالوں میں مع اصول تفسیر داخل نصاب ہے۔ تغیر اور کمی کا عمل اصلاً" علوم عقلیہ قدیم میں کیا گیا ہے۔ کیونکہ عہد اور تقاضے بدل جانے کی وجہ سے اب اسلامی علوم کی ترویج اور اسلامی فکر کا دفاع قدیم علوم عقلیہ کا زیادہ محتاج نہیں رہا۔ اب اس کی بڑی جگہ علم النفس، ادب اور لسانیات نے لی ہے۔ اس لیے منطق و فلسفہ کے صرف مبادی اور ضروری پہلوؤں سے تعارف کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ ضرورت جدید فلسفہ کو پڑھانے کی ہے جس کا رواج جدید علمی دنیا میں بڑھا ہوا ہے۔ لسانیات کے دائرے میں عربی زبان کی وسیع علمی و عملی تعلیم و مہارت کے ساتھ اردو میں اور اس کے بعد انگریزی، فارسی اور ہندی زبانوں سے واقفیت پیدا کی گئی۔ عربی اردو کے بعد دیگر زبانوں میں انگریزی زبان کی تعلیم کو زیادہ وقت دیا گیا ہے اور اس کو بھی لازمی رکھا گیا ہے۔ وہ ابتدائی مرحلہ کے بعد شروع ہوتی ہے اور عالی مرحلہ میں جا کر ختم ہوتی ہے۔ جہاں اس کے انٹرمیڈیٹ تک کا نصاب پورا ہوتا ہے۔ علوم اجتماعیہ میں تاریخ، جغرافیہ، ثقافت اسلامی، اسلامی فکر اور منحرف فکر و باطل نظریات کا تعارف، اقتصادیات اور سیاسیات کے مبادی اور ریاضی وغیرہ نصاب میں رکھے گئے ہیں۔ نیز اہم مفکرین کے محاضرات کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ تعلیم کے مراحل کو ابتدائی، ثانوی اور عالی اور تخصص کے مراحل میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان ہی کی مناسبت سے مضامین نصاب کی ترتیب و تنسیق رکھی گئی ہے۔

ابتدائی مرحلہ میں جو ۶ سالوں پر پھیلا ہوا ہے، ناظرہ قرآن و حفظ سور منتخبہ و تجوید، عقائد دینیہ و مسائل فقہیہ، اسلامی معلومات، تاریخ اسلام، اردو، ہندی، فارسی، حساب، جغرافیہ، معلومات جدیدہ اور خطوط نویسی، خوش خطی اور بعض دیگر معلوماتی اسباق ہیں اور عصری مدارس کی سطح کا معیار رکھا گیا ہے۔

ثانوی مرحلہ میں جو پانچ سالوں پر مشتمل ہے، عربی زبان و ادب و انشاء، اردو ادب و فارسی، انگریزی زبان، فقہ، معلومات دینیہ، سیرت نبوی، منتخب احادیث، صرف و نحو، تاریخ، جغرافیہ، حساب اور دیگر معلوماتی مضامین ہیں۔

درجات عالیہ کے چار سالوں میں ترجمہ و تفسیر قرآن اور متداولہ کتب تفسیر کی مراجعت نیز بیضاوی سورہ بقرہ و اصول تفسیر، صحاح کتب مع موطا و اصول حدیث، فقہ، اصول

فقہ' عقائد' ادب عربی و انشاء' نحو' تاریخ' ادب' نقد ادب' تاریخ اسلامی' جغرافیہ اسلامی' ثقافت اسلامی' دعوت اسلامی' منطق و فلسفہ' سیاسیات و معاشیات اور انگریزی ہے۔

فضیلت و تخصص کے مرحلہ میں بقیہ کتب صحاح ہیں۔ مع طحاوی و اصول حدیث' علوم قرآن و تفسیر کشاف' اسرار عبادات' اسرار شریعت' فقہ و اصول فقہ' تاریخ علوم' ادب عربی و انشاء' تاریخ دعوت و فکر اسلامی' تراجم علماء و اعلام' اصول تعلیم اور بعض دیگر مضامین شامل ہیں۔ قدیم مدارس دینیہ میں حدیث و فقہ کا جو نصاب دو یا تین آخری سالوں میں ہوتا ہے' وہ نصاب ندوہ نے مضامین کے اضافے کی وجہ سے پانچ سالوں میں پھیلایا ہے تا کہ وہ پورے ہو سکیں۔ اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ انگریزی اور عصری مضامین کے داخل نصاب کرنے سے علوم دینیہ کو نقصان نہ پہنچے۔ اس کے ساتھ دینی اخلاق و کردار کی حفاظت کے لیے اساتذہ اور نگرانی دار الاقامہ کے وسیع نظام سے کام لیا جاتا ہے۔ اس طرح عصری مضامین اور انگریزی سے اسلامی اخلاق کردار کو نقصان نہیں پہنچتا۔

جس کا کام مطلوبہ خطوط پر بتدریج انجام دیا گیا' جو نصاب تعلیم کے دائرہ میں اس تفصیل سے ہے جس کا سطور بالا میں تعارف کرایا گیا۔ یہ دینی تعلیم کو عصری تقاضوں کے ساتھ مربوط کرنے کے مقصد سے ہوا۔ ضرورت ہے کہ ہمارے عصری مدارس و جامعات بھی انقلابی قدم اٹھائیں اور اپنے نصاب تعلیم میں وہ ضروری اضافہ کریں جس سے وہاں کے طلباء صرف علم ہی حاصل کر کے ہی نہ رہ جائیں بلکہ وہ اپنی اور امت اسلامیہ کی صلاحیت و مقام پر اعتماد بھی حاصل کر سکیں بلکہ دنیا کے سامنے اعتماد کے ساتھ اپنی اور دینی برتر خصوصیات سے اثر انداز ہوں۔ ضرورت ہے کہ وہاں کے ماہرین تاریخ موقر مغربی زبانوں میں اسلام و مسلمانوں کی تاریخ کے سلسلہ میں جو غلط فہمیاں اور بے اعتمادی پیدا کی گئی ہے' اس کو اپنی تصنیف کردہ ٹھوس علمی کتابوں سے دور کریں اور اسلام اور مسلمانوں کا شاندار چہرہ واضح کریں۔ اسی طرح دیگر سماجی اور انسانی علوم میں ایسا علمی سرمایہ تیار کر دیں جو مسلمانوں کا باعزت مقام بحال کرتا ہو اور نئی نسل کے کچے ذہنوں کی صحیح رہنمائی بھی کرتا ہو۔ یہ کام ہماری مسلم عصری درسگاہوں اور مسلم اسکالروں کے ذمہ قرض ہے جس کو انہیں جلد از جلد اتارنا ہے۔

تعلیم کا مقصد انسان سازی ہے۔ انسان سازی کا مطلب وہ انسان بنانا ہے جو اپنے مستند معتقدات' معتبر اخلاق اور پختہ دین وایمان کا حامل ہو نہ کہ ہر چمکتی چیز کا دلدادہ اور دوسروں کی کسی بھی برتری کے سامنے مبہوت ہو کر اپنی ہر خصوصیت کا منکر ہو جائے۔

(ماخوذ از "مسلمان اور تعلیم")

معز امجد

دینی تعلیم کی درس گاہیں

نصاب، طریق تدریس اور طلبہ کی اخلاقی تربیت

علوم وفنون کی تدریس میں نقائص

دینی مدارس میں علوم وفنون کی تدریس کے لیے جو نصاب رائج ہے، اس میں عام طور پر، عربی یا فارسی زبان میں لکھی ہوئی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ایک ایسے طالب علم کو جو بالعموم، اردو زبان بھی بہت اچھی طرح سے نہیں جانتا، صرف، نحو، منطق، فلسفہ، ادب، بلاغت اور اس طرح کے بے شمار دوسرے فنون عربی یا فارسی زبان میں پڑھا دیے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ، ظاہر ہے، یہی نکلتا ہے کہ طلبہ، فنون پر توجہ دینے کے بجائے زبان ہی کے مسائل حل کرتے رہ جاتے ہیں۔

مزید براں، علوم وفنون کی تعلیم کے لیے، ان مدارس کے نصابات میں جو کتابیں شامل ہیں، ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سادہ اور عام فہم بات کو بھی مشکل پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ زمانے کی کروٹوں نے طرز تحریر پر اتنا کچھ اثر ڈالا ہے کہ آج یہ کتابیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انہیں لکھنے والوں کے پیش نظر، دوسروں تک اپنی بات کا ابلاغ کبھی تھا ہی نہیں۔ ان میں سادہ عبارتوں کو مغلق، اور عام فہم حقائق کو پیچیدہ بنا کر لکھا گیا ہے۔ چنانچہ، اکثر کتابوں کی شروح کو پڑھنا، جو بالعموم اسی طرز پر لکھی جاتی ہیں، ناگزیر ہوتا ہے۔ غرض، طالب علم انہی کتابوں کی بھول بھلیوں میں الجھا رہتا ہے اور اپنا اکثر وقت فنون سیکھنے کے بجائے کتابوں کی عبارتیں حل کرنے ہی میں صرف کر دیتا ہے۔

ایسی کتابیں پڑھنے ہی کا نتیجہ ہے کہ تعلیم سے فارغ ہو جانے کے بعد، دین کے یہ عالم، جب مسجد ومنبر اور مکتب ومدرسہ سنبھالتے اور عام آدمی تک دین کا پیغام پہنچانے کا کام شروع کرتے ہیں تو ان کی اپنی گفتگو کا انداز بھی، بالعموم، ان درسی کتابوں جیسا ہی ہوتا ہے۔ لب ان کے فرامین سمجھنے کے لیے بھی عام آدمی شارحین کا محتاج ہوتا ہے۔

دار العلوم دیوبند کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمن مدظلہ اس مسئلے پر اپنی ایک تقریر میں

فرماتے ہیں :

"ہمارا نصاب تعلیم کچھ تغیرات کے باوجود بڑی حد تک انہیں کتابوں پر مشتمل ہے جنہیں ملا نظام الدین سہالوی (متوفی ۱۱۶۱ھ) نے منتخب کیا تھا۔ یہ کتابیں متاخرین کی مرتب کردہ ہیں اور ان میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ اختصار کے ساتھ کتاب اپنے موضوع کے تمام مباحث ومسائل وجزئیات پر محیط ہو تاکہ طالب علم زیر درس موضوع کی تمام بحثوں پر مطلع ہو جائے۔ یہ باکمال مصنفین اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہیں مگر اختصار کے سبب ان کتابوں میں جگہ جگہ تعقید اور اغلاق کی نوعیت پیدا ہو گئی ہے اور اسی مشکل نے ایک نئی ضرورت کی طرف متوجہ کیا کہ ان مختصرات کے متون کی تشریح وتحلیل کی جائے۔ پھر یہ کہ متن کی تشریح وتحلیل کے عمل میں ضروری ہو گا کہ لغت' نحو' صرف اور بلاغت کے اصول سے کام لیا جائے اور ان کو منطبق کر کے مختصر عبارت کو قابل استفادہ بنایا جائے۔ اس طرح عبارت کے تجزیہ سے طالب علم کا ذہن مسئلہ کی مکمل صورت کو مجموعی طور پر قبول نہیں کر سکتا۔ یا یوں کہیے کہ زیر بحث موضوع کا احاطہ' یا اس موضوع پر فکر میں بالیدگی اور جلا کی شان پیدا کرنے میں یہ طریق درس ناکام ہے۔ مگر دوسری طرف اس کا زبردست فائدہ یہ ہے کہ اس سے عبارت سمجھنے کی قوت' نقد وتبصرہ کی صلاحیت' تحلیل وتجزیہ کا سلیقہ اور مشکلات کو حل کرنے کا قابل قدر ذوق پیدا ہوتا ہے۔ ایسی استعداد کے حامل طلبہ جب ان مطولات کا ازخود مطالعہ کرتے ہیں جن میں علمی مسائل اور بحثوں کو بسط وسلاست کے ساتھ تحریر کیا گیا ہو تو انہیں زبردست فائدہ ہوتا ہے اور وہ تبحر کی شان پیدا کر لیتے ہیں۔

اس کے برخلاف ایک دوسرا طریقہ تعلیم ہے جو اس دور میں رائج ہے کہ موضوع سے متعلق ایسی آسان اور سلیس کتابوں کا انتخاب کیا جائے جن میں عبارت فہمی کے لیے تحلیل وتجزیہ کی ضرورت نہ ہو بلکہ آسانی کے ساتھ مسائل کی مکمل تصویر ذہن نشین ہو جائے۔ یہ طریق درس' موضوع پر احاطہ کی صلاحیت پیدا کرنے کے سلسلے میں یقیناً کامیاب ہے لیکن تعلیم کا تجربہ رکھنے والے' اپنے تجربات کی روشنی میں عبارت فہمی' دقیقہ رسی اور مشکلات پر عبور کے سلسلے میں اس طریقہ کو ناکام سمجھتے ہیں" (ماہنامہ دار العلوم' جولائی ۱۹۹۴ء' ص ۲۴)

اس اقتباس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس طرح کی کتابیں پڑھانے کا مقصد، دراصل طلبہ کو فن میں ماہر بنانا نہیں بلکہ انہیں مشکل عبارتیں حل کرنے کی تربیت دینا ہے۔ یہ بات مولانا بھی تسلیم کرتے ہیں کہ فن کی تعلیم کے لیے، یہ کتابیں بہت فائدہ مند نہیں ہیں، اس معاملے میں آسان اور سلیس زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کا انتخاب زیادہ نفع بخش ہوگا۔ تاہم مشکل کتابیں پڑھ لینے کے بعد آسان کتابوں سے فنون سیکھنا، طلبہ کے لیے کچھ مشکل نہیں رہتا۔ یہ کام، وہ ازخود کر سکتے ہیں۔

یہ گویا ایسی ہی بات ہے کہ چھٹی یا ساتویں جماعت کے طلبہ کو سائنس کی تعلیم دینے کے لیے، سائنس کی امہات کتب میں سے کوئی کتاب، نصاب میں شامل کر لی جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ طلبہ، سائنس کا علم حاصل کریں یا نہ کریں، کم از کم اس کی کتابیں پڑھنا ضرور سیکھ لیں گے۔ اس مرحلے کے بعد، ان میں سے جو چاہے گا، آسان کتابوں سے اردو سائنس کی تعلیم حاصل کر لے گا۔ کیا یہ منطق قابل قبول ہوگی؟ کیا اس طریق تدریس کے نتیجے میں طلبہ سائنس ہی سے متنفر نہیں ہو جائیں گے؟

یہاں یہ بات واضح رہے کہ یہ کتابیں پڑھ کر، جن مشکلات کو حل کرنے کی استعداد طالب علم میں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہ قرآن وسنت کے فہم میں حائل ہونے والی مشکلات نہیں ہیں۔ یہ، دراصل، ایک خاص زمانے میں لکھی ہوئی کتابوں کو سمجھنے کی مشکلات ہیں۔ بالفاظ دیگر، یہ ایک خاص زمانے کے طرز تحریر اور اس کے علم کلام کو سمجھنے کی مشکلات ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک عالم کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ یہ تمام کتابیں پڑھ سکتا ہو، لیکن کیا یہ صلاحیت پیدا کرنے کا کوئی اور طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا؟ عبارتیں حل کرنے کی تعلیم دینے کے لیے بہت سے دوسرے طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے طالب علم کو اس طرح الجھانا ہرگز ضروری نہیں ہے کہ اصل علم کا ایک بڑا حصہ بے کار بحثوں میں ضائع ہو جائے۔ مثال کے طور پر منطق کی کتابوں پر نظر ڈالیے۔ ظاہر ہے، منطق پڑھانے کا اصل مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ طالب علم کو غور وفکر کرنے کے اس طریقے سے آگاہ کیا جائے جسے منطقی Logical کہتے ہیں۔ لیکن اسے پڑھانے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس میں اس کا اصل مقصد بہت پیچھے رہ جاتا اور طالب علم کی ساری توجہ، کتاب کی عبارتیں حل کرنے ہی پر مرکوز رہتی ہے۔ اس کے معنی، دراصل یہ ہیں کہ وہ منطق کی کلاس میں منطق کی تعلیم حاصل کر ہی نہیں رہا، بلکہ تو وہ محض عبارتیں حل کرنا سیکھ رہا ہے۔ منطق کا اصل علم، اس نے بعد میں، ازخود

حاصل کرنا ہے۔

ہمارے نزدیک، اس مسئلے کا ایک آسان حل یہ ہو سکتا ہے کہ علوم وفنون کی تعلیم کے لیے ایسی ہی کتابیں نصاب میں شامل کی جائیں جو آسان اور سلیس زبان میں ہونے کے ساتھ ساتھ، عصری اسلوب میں لکھی گئی ہوں۔ اس کے نتیجے میں طلبہ کے لیے علوم وفنون کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ ان علوم وفنون کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد، آخری سال میں، اب ایسا مضمون نصاب میں شامل کیا جا سکتا ہے جس کا مقصد صرف علمائے سلف کے طرز تحریر کو سمجھنے اور ان کی عبارتوں کی مشکلات حل کرنے کی تعلیم دیتا ہو۔

طریق تدریس سے متعلق خامیاں

ہمارے دینی مدارس میں، بالعموم، تدریس کا جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، اس میں طلبہ درسی کتابیں پڑھتے اور اساتذہ انہیں سنتے ہیں۔ اس دوران میں، طلبہ کی غلطیوں کی تصحیح اور مشکلات کے حل میں رہنمائی دی جاتی ہے۔ کسی کسی موقع پر، استاد درس سے متعلق ان سے سوالات بھی پوچھ لیتے ہیں۔

اس طریق تدریس میں سارا علم کتاب ہی سے اخذ کیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر، وہ مخصوص درسی کتاب ہی علم کی حدود وقیود طے کر دیتی ہے۔ اس سے باہر، طلبہ جاتے ہیں نہ استاد۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بارہ بارہ سال تک سر کھپانے کے بعد محض چند کتابوں کا علم حاصل ہو پاتا ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ چند کتابوں کے علم اور نفس مضمون کے علم میں بڑا فرق ہے۔ مثال کے طور پر علم تفسیر کے درس میں جلالین اور بیضاوی جیسی کتابوں کا علم تو طلبہ کو کچھ نہ کچھ حاصل ہو جاتا ہے، مگر علم تفسیر کی انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اس سے وہ ناآشنا ہی رہتے ہیں۔ یہی معاملہ نحو، بلاغت، فلسفہ اور دوسرے علوم وفنون کا بھی ہے۔

اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ ہمارے نزدیک کتابوں کے ذریعے سے تعلیم دینے کا یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ علوم وفنون کے معاملے میں، محض کتابیں پڑھ لینے سے علم حاصل نہیں ہوتا۔

علوم وفنون کی تدریس میں بالعموم تین طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک محاضراتی، دوسرے بحث وتمحیص اور تیسرے عملی تطبیق کا طریقہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

محاضراتی طریقے (Lecture Based Teaching) میں استاد لیکچر دیتا ہے۔ طلبہ اسے سنتے اور ضروری باتیں، یادداشتوں کے طور پر نوٹ کر لیتے ہیں۔ اس طریقے سے استاد

ہی مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ زیر درس علم وفن کے بارے میں اپنے مطالعہ اور تجربات کا نچوڑ طلبہ کے سامنے رکھ دے۔ طلبہ کے نقطہ نظر سے یہ طریقہ بہت آسانی پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن مجرد اسی طریقے کا استعمال طلبہ کی قوت مطالعہ کے لیے بہت مضر ہو سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں مطالعہ کرنے کی عادت اور اس کا شوق بالکل ختم ہو سکتا ہے اور طلبہ میں علم کے لیے محنت اور جستجو کا رجحان بالکل تباہ ہو سکتا ہے۔

دوسرا طریقہ بحث وتمحیص کا ہے۔ اس کے تحت طلبہ متعلقہ کتابیں پڑھ کر ان کی عبارتوں کی صرفی ونحوی مشکلات حل کر کے، معاجم اور لغات کی مدد سے الفاظ کے معانی طے کر کے اور عبارتوں کے مفہوم بھی خود ہی متعین کر کے آتے ہیں۔ کلاس کے اندر کتابیں پڑھنے کی بجائے نفس مضمون پر بحث ہوتی ہے۔ طلبہ، اپنے فہم کے مطابق مسائل پر گفتگو کرتے، اس کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کرتے اور اپنے مطالعے کے نتائج کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ یہ سارا کام استاد کی رہنمائی ہی میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی توجہ طلبہ کی باقی رہ جانے والی مشکلات کو حل کرنے اور ان کے فہم کی غلطیوں کی اصلاح کرنے پر مرکوز رکھتا ہے۔ اس طریقے سے طلبہ کی قوت مطالعہ ابھرتی اور ترقی کرتی ہے۔ مزید برآں کوئی نئی کتاب یا عبارت ان کے سامنے آ جائے تو اس کا مفہوم متعین کرنے کی انہیں تربیت بھی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن مجرد اس طریقے کو استعمال کرنے سے بہت سا وقت ضائع ہو سکتا ہے۔ اگر طلبہ کو مضمون کے تعارف کے بغیر اس طریقے کو اختیار کیا جائے تو اس کے نتیجے میں بحث کا دائرہ محدود رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس طریقہ کو اختیار کرنے سے پہلے استاد زیر بحث موضوع کا مختصر تعارف طلبہ کے سامنے پیش کر دے۔

تیسرا طریقہ عملی تطبیق (Practical Application) کا ہے۔ اس کے تحت طلبہ ان اصول وقواعد کو استعمال میں لا کر عملی مسائل کا حل دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طریقے کو Case Study Method بھی کہا جاتا ہے۔ مختلف کیس طلبہ کو حل کرنے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ مقررہ تاریخ پر تمام طلبہ اپنے اپنے مجوزہ حل استاد کے پاس جمع کراتے ہیں۔ اس کے بعد تمام مجوزہ حل کلاس میں زیر بحث لائے جاتے اور ان پر نقد وتبصرہ کیا جاتا ہے۔ تجویز پیش کرنے والا اپنے حل کا دفاع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طریقے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں طلبہ زندگی کے حقیقی مسائل میں ان اصول وقواعد کی عملی تطبیق کی تربیت بھی پاتے ہیں جنہیں وہ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ اس لحاظ

سے طلبہ کی آئندہ علمی و عملی زندگی کے لیے بظاہر یہی طریقہ سب سے زیادہ فائدہ مند لگتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس طریقے کا بنیادی نقص یہ ہے کہ اسے اسی وقت استعمال کیا جا سکتا ہے جب طلبہ کو کسی معاملے میں اصول و قواعد کی تعلیم دی جا چکی ہو۔ اس سے پہلے یہ طریقہ بہت زیادہ نفع بخش نہیں ہو سکتا۔ بالفاظ دیگر یہ طریقہ اصول و قواعد کی عملی تطبیق کی تربیت کے لیے تو بے شک سب سے بہتر ہے مگر بالعموم ان اصول و قواعد کی تفہیم کے لیے اسے استعمال کرنا کچھ مشکل ہے۔

ہمارے نزدیک طلبہ میں بہترین صلاحیتیں پیدا کرنے کے لیے تدریس کے یہ تینوں طریقے ایک خاص ترتیب کے ساتھ استعمال میں لانے چاہئیں۔ کسی نئے فن یا مضمون کے تعارف کے لیے سب سے پہلے محاضراتی طریقہ ہی اختیار کرنا چاہیے۔ ان محاضرات ہی میں اس فن کی اہم اصطلاحات اور اس کی امہات کتب کا تعارف بھی کرا دینا چاہیے۔ اس کے بعد اس فن کے اہم مباحث اور ان کے اجزاء کا بھی ایک ترتیب کے ساتھ' تعارف کرا دینا چاہیے۔ یہ مرحلہ طے کر لینے کے بعد بحث و تمحیص کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس کے تحت طلبہ کو مطالعے کے لیے اس فن کی چند اہم کتابوں سے کام دیا جا سکتا ہے۔ یہ کام بنیادی طور پر مطالعاتی منصوبوں (Study Projects) کی نوعیت کا ہونا چاہیے۔ طلبہ کو چھوٹے چھوٹے موضوعات پر تیاری کر کے ان موضوعات پر مباحثوں اور لیکچرز کی تیاری کرائی جائے۔ مقررہ تاریخ میں طلبہ کلاس کے اندر مباحثوں اور لیکچرز کی صورت میں اپنا نقطہ نظر بیان کریں اور اپنے نقطہ نظر کا کلاس کے سامنے دفاع کریں۔ یہ دونوں طریقے اگر صحیح طرح سے عمل میں لائے جائیں تو اس کے نتیجے میں طلبہ ایک فن کے اصول و قواعد کو بڑی اچھی طرح سے جان لیں گے۔ اس کے بعد جس فن کے لیے ضروری سمجھا جائے' اس میں عملی تطبیق کی تربیت کے لیے Case Study کا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

طلبہ کی تربیت کے پہلو سے خامیاں

اس وقت ہمارا معاشرہ مجموعی طور پر جس اخلاقی پستی کا شکار ہے' دینی مدارس بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ عام لوگ جھوٹ بولتے ہیں تو دینی مدارس کے طلبہ اور اس سے فارغ ہونے والے علمائے دین کا حال بھی کوئی بہت اچھا نہیں ہے۔ وہ اپنے روز مرہ کے معمولات میں دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں تو یہ بھی اس معاملے میں کچھ زیادہ پیچھے نہیں ہیں۔ وہ اگر مفاد پرستی کا شکار ہیں تو ان میں بھی بے لوث خدمت کرنے والوں کی تعداد کوئی زیادہ نہیں ہے۔

ان کے لینے اور دینے کے باٹ اگر الگ الگ ہیں تو یہ بھی اپنے معاملات میں بہت زیادہ راست نہیں ہیں۔ وہ جذبات میں آکر اگر بد زبانی کر بیٹھتے ہیں تو اس معاملے میں ان کے اخلاق بھی کوئی اچھا نمونہ پیش نہیں کرتے۔ غرض کہ عام آدمی نے اگر پیغمبر کے اسوہ کو فراموش کر دیا ہے تو پیغمبر کے ان نام لینے والوں اور خدمت دین کا لبادہ اوڑھنے والوں نے بھی آپ ﷺ کو اپنا آئیڈیل نہیں بنایا۔

اسلامی دنیا کے جرائد واخبارات میں وقتاً" فوقتاً" دینی مدارس میں اخلاقی تربیت کے فقدان اور ان سے فارغ ہونے والے افراد کی پست اخلاقیات پر نکتہ چینی ہوتی رہتی ہے۔ اس کے مقابلے میں دینی مدارس کی طرف سے بالعموم دو قسم کے رویے سامنے آئے ہیں۔ کچھ لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ اخلاقی پستی یقیناً عام لوگوں کا مسئلہ تو ہے مگر دینی مدارس سے فارغ ہونے والے افراد کا مسئلہ ہرگز نہیں ہے۔ ان کا اصرار ہے کہ دینی مدارس میں طلبہ کی ایسی شان دار تربیت کی جاتی ہے کہ اپنی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ بہترین اخلاق کا نمونہ اور معاشرے کے عام لوگوں کے لیے ایک شان دار اسوہ ہوتے ہیں۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

اس کے برعکس کچھ لوگ یہ اعتراف تو بہرحال کرتے ہیں کہ ان مدارس سے نکلنے والے طلبہ کا اخلاق وکردار مطلوبہ معیار سے بہت نیچے ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ اصرار کرتے ہیں کہ معاشرے کے ارباب سیاست' اس کے اہل اقتدار' اس کے ارباب حل وعقد' اس کے لیڈروں' اس کے منتظمین اور اس کے اہل شوکت کے مقابلے میں ان طلبہ کے اخلاق وکردار کا معیار بہرحال بہت بلند ہے۔

جہاں تک پہلے نقطہ نظر کا تعلق ہے' اس کی غلطی جاننے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ ان مدارس کے کسی طالب علم یا اس سے فارغ التحصیل کسی "عالم دین" کے کسی نقطہ نظر پر تنقید کر دیجئے' اس کے ساتھ کسی علمی مباحثے میں حصہ لے لیجئے یا اصلاح کے کسی پہلو پر اسے توجہ دلا دیجئے۔ اس کے نتیجے میں بالعموم آپ کے سامنے اخلاق وکردار کا ایسا نمونہ پیش ہوگا جس کی پیروی آپ کے لیے ممکن ہوگی اور نہ پسندیدہ۔

فان کنت لا تدری فتلک مصیبة
وان کنت تدری فالمصیبة اعظم

"اگر تم نہ سمجھو تو یہ بھی ایک مصیبت ہے۔ لیکن اگر تم سمجھتے ہو (اور پھر یہ رویہ

اپنائے ہوئے ہو) تو مصیبت بہت بڑی ہے"

اس کے برعکس' دوسرا نقطہ نظر اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ ان مدارس سے نکلنے والے لوگوں سے اخلاق و کردار کے معاملے میں وہی معیار مطلوب ہے جس کی توقع معاشرے کے ڈاکٹروں' انجینئروں' وکیلوں' سیاست دانوں اور ارباب حل و عقد سے کی جاتی ہے۔ وہ شاید یہ بھول گئے ہیں کہ دین کے یہ عالم دراصل زمین کے نمک ہیں' دنیا کے نور ہیں اور اخلاق و کردار کی اس تاریکی میں رہنمائی کے چراغ ہیں۔ جنہوں نے دنیا کے لیے معیار بننا ہے' آخر وہ اپنے آپ کو دنیا کے معیار پر کیسے پرکھ سکتے ہیں؟ جن کے وجود سے دنیا نے روشنی پائی ہے' آخر وہ دنیا کی تاریکیاں اپنے اندر کیسے سمیٹ سکتے ہیں؟ جن کے وجود سے دنیا نے دوسروں پر دین حق کی وضاحت اور دنیا کی رہنمائی کا کام کرنا ہے' آخر وہ دوسروں سے اپنا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟

معاشرے کا حال جو بھی ہو' دین کے کسی عالم اور داعی کو جب بھی پرکھا جائے گا' اعلیٰ ترین معیار پر ہی پرکھا جائے گا۔ اس راہ کا مسافر بننے سے پہلے' آدمی کو بہت اچھی طرح سے سوچ سمجھ لینا چاہیے۔ یہ راہ اختیار کر کے' وہ اپنے آپ کو معاشرے کی تنقید کا ہدف بنا رہا ہے۔ پورا معاشرہ' اپنی آنکھ کے شہتیر سے تو صرف نظر کر لے گا' مگر اس کی آنکھ کا تنکا اسے کبھی چین نہ لینے دے گا۔ دنیا میں دین کے کسی عالم یا داعی کے لیے اگر کوئی معیار ہو سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف اس ہستی کا ہو سکتا ہے جس کے بارے میں عالم کے پروردگار کا فرمان ہے

انک لعلی خلق عظیم (القلم ۶۸ : ۴)

"اے پیغمبرؐ بے شک تم اخلاق کے اعلیٰ ترین معیار پر ہو"

سخت ترین حالات میں پوری استقامت کا مظاہرہ کرنا' دوسروں کے سب و شتم کے جواب میں مسکرا دینا' علمی اختلافات کو خوش دلی سے برداشت کرنا' نفرتوں کا جواب محبت سے دینا' دوسروں کی غلطیوں اور خطاؤں پر عفو و درگزر سے کام لینا' کفر و فسق کے فتووں پر اپنی زبان بند رکھنا' مجادلوں اور مناظروں سے گریز کرنا' کسی کی دل آزاری نہ کرنا' کسی کے ساتھ ترش روئی سے بات نہ کرنا' اپنی غلطیاں مان لینا' لوگوں کے دکھ سکھ میں ان کا ساتھی بننا' ان پر تنقید کے بجائے انہیں نصیحت کرنا' اپنے لیے سخت ترین اور دوسروں کے لیے نرم معیار رکھنا' بے شک' یہ سب کچھ آسان نہیں ہے۔ اپنے رب کے ساتھ مضبوط تعلق اپنے پیغمبر کے ساتھ بے پناہ محبت' ذمہ داری اور روز قیامت کی جواب دہی کے زندہ احساس اور دل

میں اپنے بھائیوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کی تڑپ کے بغیر' اخلاق و کردار کا یہ معیار حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس سب کچھ کے ساتھ ساتھ بد ترین حالات میں اخلاق و کردار کے اس اعلیٰ مقام پر برقرار رہنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دل نصرت دین کے جذبے سے سرشار ہو اور اللہ کے دین کے لیے اپنی جان' مال اور آبرو کی قربانی کو قابل فخر سمجھا جائے۔

یہ واقعہ ہے کہ امت کی تاریخ میں اخلاق و کردار کے لحاظ سے کمزور لوگوں پر علم دین کے معاملے میں کبھی اعتماد نہیں کیا گیا۔ تاریخ کے اوراق جن علماء کے ناموں سے روشن ہیں' وہ محض علم ہی کی بلندیوں پر فائز نہیں تھے' اپنے اخلاق و کردار میں بھی آسمان کے ستارے تھے۔ شدید مصائب کے مقابلے میں ان کی ثابت قدمی اور عزیمت کی داستانیں' تاریک راتوں میں روشن قندیلیں ہیں۔

شدید گرمی کے موسم میں سعید بن مسیب کو کھجور کے درخت سے باندھ کر درے مارے جا رہے ہیں۔ ان کی پیٹھ لہولہان ہو گئی ہے۔ وہ بھوک' پیاس اور تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو گئے ہیں۔ ان پر پانی ڈال کر ہوش میں لایا گیا ہے۔ مگر ان کی زبان' اعلان حق میں پہلے سے بھی زیادہ سرگرم ہے۔

انس کے بیٹے مالک کی مشکیں کسی جا رہی ہیں۔ ان کی پیٹھ پر تازیانے برس رہے ہیں۔ مگر وہ بادشاہ وقت کے فرمان کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔ ان کی مشکیں اور زور سے کسی جاتی ہیں۔ ان کے دونوں بازو اکھڑ گئے ہیں۔ ان کا چہرہ کرب والم کی داستان سنا رہا ہے۔ مگر ان کی زبان اب بھی وہ کہنے کو تیار نہیں' جو حاکم وقت ان سے کہلانا چاہتا ہے۔ اب' ایک نیا حربہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ اونٹ کی برہنہ پیٹھ پر سوار کر کے' انہیں شہر کا گشت کرایا جا رہا ہے۔ شاید' یہ تذلیل وہ برداشت نہ کر سکیں۔ ان کی زبان کھلتی ہے۔ آواز نکلتی ہے: جو مجھے جانتا ہے' وہ تو مجھے جانتا ہے۔ جو مجھے نہیں جانتا' وہ جان لے کہ میں انس کا بیٹا مالک ہوں اور میں اعلان کرتا ہوں کہ طلاق مکرہ کوئی چیز نہیں ہے۔ (طلاق مکرہ ایسی طلاق کو کہتے ہیں جس میں کسی شخص کو مجبور کر کے' اس سے طلاق کا لفظ کہلوایا گیا ہو)

معتصم باللہ کے دربار سے احمد بن حنبل کو زنجیروں میں جکڑ کر نکالا گیا ہے۔ انہیں بہت سے جلاد باری باری تازیانے لگا رہے ہیں۔ ان کا پورا جسم لالہ رنگ ہو گیا ہے۔ مگر اس کے باوجود جس مسئلے کو وہ کتاب وسنت کے خلاف سمجھتے ہیں' اس کا اقرار کرنے پر ان کی زبان آمادہ نہیں ہوتی۔

دیکھ لیجئے' یہ سب لوگ اپنے اخلاق و کردار ہی میں ایسے اعلیٰ مقام پر فائز نہیں ہیں' اس کے ساتھ ساتھ' دین کی نصرت کا جذبہ بھی ان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے وقت کے حاکموں کے سامنے' یہ سوچ کر سر جھکانے سے انکار کر دیا کہ جب کائنات کے بادشاہ سے ملاقات ہوگی تو اسے کیا منہ دکھائیں گے۔ ان کی زبان یہ سوچ کر موافقت سے گریز کرتی رہی کہ ان کا یہ عمل کہیں لوگوں کو دین کے علما اور بالآخر دین ہی سے بیزار کرنے کا باعث نہ بن جائے۔ انھوں نے دنیا کے جابروں کے ظلم وستم کو یہ سوچ کر برداشت کر لیا کہ کہیں وہ اپنی ہی نظروں میں نہ گر جائیں۔ ایسے ہی لوگوں سے ہر زمانے میں دنیا والوں نے روشنی پائی ہے۔ یہ روشنی کے وہ مینار ہیں جو گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹکتے ہوئے مسافروں کے لیے مشعل راہ بنے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے اپنے زمانے نے بالعموم ان کی قدر نہ کی اور انہیں زندگی میں طرح طرح کے مصائب اور مشکلات ہی کا سامنا رہا' مگر یہ واقعہ ہے کہ دنیا انہی لوگوں کو ہمیشہ یاد رکھے گی' انہیں کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔

مثالک خر عینی وذکر خر فمی
وحبک خر قلبی فاین تغیب

"میری آنکھوں میں تمہاری صورت' میرے ہونٹوں پر تمہارا تذکرہ' اور میرے دل میں تمہاری محبت موجود ہے۔ کون کہتا ہے کہ تم موجود نہیں ہو"

یہی وہ کردار ہے جو ایک عالم کو' محض ایک عالم سے بلند کر کے معاشرے کے لیے نمونہ اور آئیڈیل بنا دیتا ہے۔ مگر' وہ جنہیں معاشرے کا آئیڈیل ہونا چاہیے' جب معاشرے ہی کو اپنا آئیڈیل بنا لیں' وہ جنہیں صفائی کا کام سونپا گیا ہو' جب خود گھر میں گندگی پھیلانے لگیں اور وہ جنہیں قوم وملت کی اصلاح کا کام کرنا تھا' جب خود جہالتوں اور گمراہیوں میں پڑ جائیں تو پھر کسی اصلاح اور بہتری کی توقع آخر کس بنیاد پر کی جائے گی؟

اس صورت حال میں یہ ناگزیر ہے کہ دینی مدارس کے ان طلبہ کے سامنے' اخلاق وکردار کے اعلیٰ ترین معیارات مقرر کیے جائیں۔ بہترین اخلاق وکردار کے حامل لوگوں کو ان کا آئیڈیل بنایا جائے۔ اس مقصد کے لیے نبی کریمؐ آپ کے صحابہؓ اور امت کے صالحین اور اصحاب عزیمت کی سیرت وکردار کا خاص اس پہلو سے مطالعہ کرایا جائے' اور اس کے ذریعے سے ان کے ذہنوں میں ان بزرگوں کی حقیقی قدر ومنزلت کو اجاگر کیا جائے اور ان کے دلوں میں ان کے ساتھ محبت کے جذبات ابھارے جائیں۔ بہت جلد یہ محبت آپ سے آپ ان

کے اندر بھی اخلاق و کردار کی اس بلندی تک پہنچنے کا جذبہ پیدا کر دے گی کہ

احب الصالحین ولست منهم
لعل الله یرزقنی الصلاحا

اس کے ساتھ طلبہ کی عملی تربیت اور تزکیہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انہیں روزانہ صالح علماء کی صحبت میں کچھ وقت گزارنے کا پابند کیا جائے۔ انہیں ترغیب دی جائے کہ وہ قرآن و حدیث کے ان ارشادات میں خاص طور پر دھیان لگائیں جو اصلاح نفس اور تربیت اخلاق سے متعلق ہیں۔ مزید برآں' دین کی نصرت کا جذبہ بھی ان کے اندر پیدا کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ دین حق کے غلبے کے لیے دعوت و انذار' بہرحال ان کی دینی ذمہ داری ہے۔

(بہ شکریہ "اشراق" لاہور)

تاریخ کے پچھلے ادوار میں ایک فریق اور دوسرے فریق کے درمیان زیادہ تر کمیاتی فرق (Qualitative difference) ہوا کرتا تھا۔ اب اہل مغرب نے ایسا دور تخلیق کیا جب کہ ان کے اور دوسروں کے درمیان کیفیاتی فرق (Quantitave difference) پیدا ہو گیا۔ اس تبدیلی نے اہل مغرب کو دوسری قوموں کے اوپر واضح اور فیصلہ کن فوقیت دے دی۔

ان فروق نے جس طرح حالات کو بدلا' اسی طرح خود انسانوں میں زبردست تبدیلیاں پیدا کیں۔ اب اہل مغرب نئی دریافت کی نفسیات میں جی رہے تھے اور اہل مشرق وراثتی عقیدہ کی نفسیات میں۔ اہل مغرب اجتہادی اوصاف کے مالک تھے اور اہل مشرق تقلیدی اوصاف کے مالک۔ اہل مغرب کے درمیان آزادی تنقید کا ماحول تھا اور اہل مشرق کے یہاں ذہنی جمود کا ماحول۔ اہل مغرب کا قافلہ رواں دریا کی مانند تھا اور اہل مشرق کی جماعت ٹھہرے ہوئے پانی کی مانند۔ اہل مغرب ایک مقصد کے تحت متحرک ہوئے تھے اور اہل مشرق کے یہاں مقصد کا تصور فنا ہو چکا تھا۔ اہل مغرب کے زندہ اوصاف نے ان کو باہم متحد کر رکھا تھا اور اہل مشرق اپنے زوال یافتہ اوصاف کے نتیجہ میں ان خصوصیات سے محروم ہو چکے تھے جو افراد کو ایک دوسرے سے متحد کرتے ہیں۔ اہل مغرب اس احساس پر ابھرے تھے کہ انہوں نے ایک نئی تہذیب پیدا کی ہے جس کو انہیں سارے عالم تک پہنچانا ہے اور اہل مشرق صرف اس احساس پر زندہ تھے کہ وہ ماضی کے قدیم اثاثہ کے وارث ہیں۔ اہل مغرب اقدام کے جذبات سے بھرپور تھے جبکہ اہل مشرق کی دوڑ کی آخری حد تحفظ پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔

(مولانا وحید الدین خان)

ابو ہشام ریاض اسماعیل ۔ لاہور

دینی مدارس کے نصاب کی اصلاح

مدارس عربیہ کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اصلاح نصاب کا ہے۔ اکثر حلقوں میں نصاب کی اصلاح کے لیے کوششیں جاری رہی ہیں۔

اس حقیقت میں کوئی کلام نہیں کہ معروف نصاب "درس نظامی" اپنے دور کے حالات کے مطابق تھا اور اس زمانے کے تقاضوں کو کامل طور پر پورا کر رہا تھا۔ اس وقت کی جملہ ضروریات کے لیے یہ نصاب ہی کافی تھا۔ اس وقت دینی اور دنیوی تعلیم کی کوئی جداگانہ حد بندی اور تخصیص بھی نہ تھی۔ ریاست کا نظم و نسق سنبھالنے والے اہلکار' تجارتی کاروبار چلانے والے تجار اور ادیب و شاعر سبھی اس نظام تعلیم اور نصاب تعلیم سے تیار ہوتے تھے۔

دور حاضر کے بدلے ہوئے حالات میں سیاسی' سماجی نظام' اقتصادی و معاشی احوال' تجارتی و صنعتی کوائف' قومی اور بین الاقوامی سطح پر دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا ہوا ہے۔ مدارس دینیہ میں ایک ایسی جامع تبدیلی کی ضرورت ہے جو سابق کی طرح "دین و دنیا" کی تفریق سے بالاتر ہو کر اپنے زمانے کی تمام علمی اور دینی ضروریات کو پورا کر سکے اور مسائل حل کرنے پر قادر ہو۔

نصاب تعلیم کی اہمیت

انسانی ذہن و فکر کی تعمیر' قول و فعل' فکر و عمل میں توازن اور کردار سازی میں نصاب تعلیم اور نظام تربیت سب سے موثر کردار ادا کرتا ہے۔ عقیدہ اور عمل' معاشرے کا مزاج ورجحان' حکومت کی ساخت اور تنظیم' یہ سب نظام تعلیم و تربیت کے تابع ہوتے ہیں۔

درس نظامی میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف ادوار میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ سب سے زیادہ تبدیلیاں فلسفہ' منطق اور علم الکلام کی کتابوں میں ہوئیں۔ اگر یہ تبدیلیاں قدیم صالح اور جدید نافع کے حسین امتزاج کو پیش نظر رکھتے ہوئے کی جاتیں اور ان میں مضمر حقائق اور مفادات کا ادراک بہت پہلے کر لیا جاتا تو عالم اسلام کو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتے۔

دینی مدارس حالات میں تیز تبدیلیوں سے بے خبر رہے۔ ان میں کوئی بیداری اور حرکت پیدا نہ ہوئی۔ نئے مسائل پر توجہ اور نئے سوالات کا جواب کماحقہ نہ دے سکے۔

انہوں نے نئے اقدامات کرنے کی بجائے قدامت پسندی پر ڈٹے رہنے کو کامیابی سمجھا۔ ان دینی مدارس میں معقولات کی ان کتابوں پر، جن کی ضرورت بیسویں صدی میں نہیں تھی، غیر معمولی توجہ دی گئی۔ اس پر اساتذہ کی محنت اور طلبہ کا قیمتی وقت ضائع کیا گیا۔ اس کے برعکس دینی علوم بالخصوص قرآن وحدیث پر بہت کم توجہ دی گئی جس سے ان کا تعلق تمدن و تہذیب کی لازوال قوت سے کمزور ہو چکا ہے۔ جدید افکار و نظریات سے ناواقف ہے اور نصاب تعلیم صالح اور موزوں افراد پیدا کرنے کی بجائے ایسے لوگ پیدا کر رہا ہے جن میں باہمی منافرت، فلسفیانہ مباحث اور فقہی اختلاف پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔

تبدیلی کیوں؟

۱۔ درس نظامی میں شامل بعض مضامین آج کل استعمال نہیں ہوتے۔

۲۔ عصر حاضر کی ضروریات اور مسائل حاضرہ کو حل کرنے کے لیے بعض جدید مضامین کو شامل نصاب کرنا نہایت ضروری ہے۔ خصوصاً" اقتصادیات، عمرانیات اور سیاسیات میں۔

۳۔ درس نظامی کی بعض کتابیں اتنی پرانی اور قدیم ہیں کہ وہ اپنی افادیت کھو چکی ہیں۔

۴۔ علوم و فنون کی جدید کتابوں کو شامل نصاب کیا جائے تاکہ مفید معلومات اور جدید اصطلاحات سے طلبہ کو آگاہی ہو۔

۵۔ دور حاضر کی نئی تحریکوں کو سمجھنے کے لیے اور ان کے بارے میں اسلامی نظریات قائم کرنے کے لیے مناسب کتب نصاب میں شامل کی جائیں۔

۶۔ دینی مدارس کے طلبہ میں معلومات عامہ کا فقدان شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے تاریخ، جغرافیہ، ابتدائی سائنس اور دیگر ضروری علوم شامل نصاب کیے جائیں۔

قدیم نصاب پر تنقید، جرح و قدح اور جدید نصاب کے تعین سے قبل ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ طے کرلیں کہ اس تعلیم سے غرض اور مقصد کیا ہے۔

ان دینی مدارس میں جملہ معاشرتی ضروریات کے پیش نظر مندرجہ ذیل خصوصیات کے حامل افراد پیدا کیے جانے چاہئیں۔

- اسلام کے مخلص داعی
- دین کے معتدل مزاج اور صاحب بصیرت مبلغ و خطیب
- علوم اسلامیہ پر گہری نظر رکھنے والے محقق

- بہترین مصنف اور مولف
- علوم قدیم و عصر حاضر کے جدید مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں
- تقابل ادیان پر گہری نظر رکھتے ہوں۔

کون کون سی کتابیں اب غیر مفید ہیں

قواعد (علم الصرف اور علم النحو) اگر ممکن ہو تو فارسی میں لکھی گئی کتابوں کی جگہ ان مضامین پر اردو زبان میں تحریر شدہ کتب یا پھر آسان عربی کتب شامل نصاب کی جائیں۔ مثلاً" نحو میر' زرادی' صرف میر' علم الصیغہ' میزان الصرف وغیرہ' ان کی جگہ اردو زبان میں لکھی گئی علم الصرف' علم النحو یا کتاب الصرف اور کتاب النحو شامل نصاب کی جائیں۔

نحو کی مشہور کتاب شرح جامی' اس کی جگہ شرح ابن عقیل پڑھائی جائے۔ کیونکہ قواعد (گرامر) پڑھنے کا مقصد قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لیے عربی زبان سیکھنا ہے۔ شامل نصاب بعض کتابیں ایسی ہیں جن کو پڑھتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ اس میں غیر متعلق مباحث اور تشریحات ہیں' جن کے نتیجے میں قاری نفس مضمون اور جن مقاصد کے لیے کتاب لکھی گئی ہے' اس سے دور ہو جاتا ہے۔

منطق

منطق کی کتابوں میں خاص طور پر تخفیف کی ضرورت ہے۔ منطق کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں' ان کے فوائد کم اور نقصانات زیادہ ہیں۔ بعض مدارس میں ایسا وقت بھی آیا کہ صرف علم منطق پر ایک طالب علم کو پندرہ پندرہ کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ اور ان کتابوں میں سے بعض میں اس قدر خلط مبحث ہوتا کہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس فن کی کتاب ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اس فن کی کوئی ایک آسان عام فہم کتاب شامل نصاب کی جائے تا کہ طالب علم منطق کی اصطلاحات کو ذہن نشین کر لے۔ اور جب متقدمین کی کتابوں کا مطالعہ کرے تو اس کو مفاہیم و معانی کا صحیح ادراک ہو سکے۔ اس لیے کہ متقدمین کی کتابوں میں یہ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں نہ کہ یہ اصطلاحات اس قدر ذہن میں پختہ ہو جائیں کہ احتمال آفرینی کی عادت ڈال لے اور ان کو بنیاد بنا کر قرآن وحدیث کے الفاظ کا معنی و مفہوم متعین کرتا پھرے۔

فلسفہ

فلسفہ کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن قدیم کتب کی پیچیدگیاں اور بعض فرسودہ

مسائل ضرور قابل تبدیل ہیں۔ دوسرا عام رجحان یہ ہے کہ جدید فلسفیانہ تحقیقات کو بھی شامل کیا جائے اور یونانی فلسفہ کی جگہ خالص اسلامی نظریات کو بالخصوص پیش نظر رکھا جائے۔ مثلاً" میبذی، شرح چغمینی وغیرہ میں اس قدر خلط مبحث ہے اور تعقید ہے کہ طالب علم ان کو حل کرتے وقت ذہنی صلاحیت صرف کر دیتا ہے۔

ادب عربی اور عربی زبان

اس بارے میں علمائے کرام کے درمیان عموماً" یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ قدیم عربی ادب کا نمایاں حصہ شامل نصاب ہونا چاہیے تا کہ قرآن وحدیث کی زبان سے دور نہ چلے جائیں۔ البتہ جدید عربی ادب اور زبان کی تدریس بھی بہت ضروری ہے۔ ادب کی جتنی کتابیں داخل نصاب ہیں، سبعہ معلقہ، المتنبی، الحماسہ، نفحۃ الیمن، مقامات حریری، انتہا درجے کی کتابیں ہیں۔ اس میں ایسی کتابوں کی کمی ہے جو ابتدائی تعلیم کے لیے کافی ہوں جس سے سلیس عبارت کا روز مرہ کے موافق لکھنا، بولنا اور سمجھنا آجائے۔ ابتداء میں صرف ونحو کے ساتھ ایسے چھوٹے چھوٹے رسالے پڑھائے جائیں جس میں چھوٹے چھوٹے فقرے اور چھوٹی اور مختصر حکایتیں ہوں۔ لیکن یہ حکایتیں اور فقرے کسی عرب مصنف کے لکھے ہوئے ہوں۔ قرآن اور حدیث سے چھوٹے چھوٹے سلیس فقرے نکال لیے جائیں اور شعراء عرب کے کلام سے نہایت سلیس اور آسان اشعار منتخب کیے جائیں۔ اور ان کی تعلیم ابتدائی جماعتوں سے شروع کی جائے۔ نحو وصرف آتی ہو یا نہ، محض الفاظ کے معنی یاد کروائے جائیں۔ جیسے فارسی پڑھنے والوں کو ابتداء میں فارسی (گلستان) پڑھائی جاتی ہے۔

تاریخ

اس علم سے دینی مدارس کے بیشتر طلبہ محروم ہیں۔ اسلامی تاریخ سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ ماضی قریب، ملکی تاریخ، ماضی کی حکومتوں کے عروج و زوال کے اسباب جاننا تو دور کی بات۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے سیرت النبی ﷺ، سیرت الصحابہؓ کے بارے میں توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

تاریخ سے مراد محض سیاسی تاریخ کا مطالعہ نہیں (اگرچہ یہ بھی ضروری ہے) اس کے ساتھ ساتھ ثقافتی اور تمدنی تاریخ پر عبور درکار ہے۔

ہیئت، ہندسہ اور طب

ان علوم کی اہمیت و افادیت واضح ہے مگر درس نظامی میں ان مضامین کی جو کتب شامل

ہیں، ان میں سے بیشتر اپنی افادیت کھو چکی ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ ان مضامین پر جدید ترین معلومات اور حقائق کو شامل کر کے اپنے علم کو تازہ اور جدید بنایا جائے۔

فقہ اور اصول فقہ

یہ علم نصاب کے اہم ترین اجزاء میں سے ہے۔ اس کے بارے میں بعض لوگ دو امور کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ایک تو وسعت نظر اور تعصب کے خاتمہ کی خاطر مذاہب اربعہ کی فقہ شامل نصاب کی جائے۔ گو یہ کام بظاہر مشکل اور طویل ہے۔

دوسرا تدوین فقہ کی طرف علماء خصوصی توجہ دیں۔ جدید مسائل کا حل اشد ضروری ہے۔

چونکہ پاکستان میں زیادہ تر لوگ فقہ حنفی کے عاملین ہیں، وہ اس کا علم رکھتے ہیں یا نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر ایسے لوگوں کے سامنے مسائل کو حدیث کی روشنی میں پیش کیا جائے تو کسی حد تک مانتے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ حدیث کی روشنی میں "فقہ السنہ" کی طرف پوری توجہ دی جائے۔ لیکن اس معاشرے میں رہنے والے دوسرے افراد کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی فقہ کی متداول کتابیں بھی پڑھائی جائیں تاکہ بوقت ضرورت ان کو کافی اور شافی جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں دیا جائے۔

اصول الفقہ کی مشہور کتابیں اصول الشاشی، نور الانوار، حسامی، مسلم الثبوت مخصوص مسلک کی خدمت کے لیے وضع کی گئی ہیں۔ اب اس امر کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ جمہور اہل سنت کے مذہب اور منہج کے مطابق اصول ومقررات وضع کیے جائیں۔

عقیدہ

اکثر مدارس میں متاخرین اشاعرہ کی کلامی کتابوں کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کی جگہ آج کل مدارس میں عقیدہ سلف کی تعلیم کے لیے کتاب التوحید، فتح المجید، العقیدہ الواسطیہ اور شرح عقیدہ طحاویہ داخل نصاب کی جائیں۔ یقیناً یہ کتابیں بڑی مفید ہیں، لیکن کسی غیر مسلم معاشرے میں دعوت کا کام کرنے کے لیے اور داعی کے لیے ان کتابوں کا پڑھنا کافی نہیں ہے بلکہ عصر حاضر کے فکری رجحانات، باطل مذاہب وادیان، جدید فلسفہ کے مسائل کو حل کرنے کے لیے جدید نظریات سے آگاہی بھی ضروری ہے۔

تقابل ادیان کا مطالعہ بحیثیت ایک مستقل مضمون پڑھایا جائے۔ پاکستان میں مسیحی مبلغ اور مشنری جماعتیں انتہائی منظم اور موثر انداز میں عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔ اس ناگوار صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے مبلغین کی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔

حدیث اور علم الحدیث

دور حاضر کے پیدا شدہ مسائل کے حل کے لیے احادیث کی جدید تبویب (باب بندی) ضروری ہے۔ حدیث کے مقررات معروف ہیں۔ منکرین حدیث کے جوابات دینے کے ساتھ ساتھ جدید مسائل کے مطابق احادیث کا انتخاب کر کے باب بندی کی جائے۔

اصول حدیث مرحلہ وار پڑھائے جائیں۔ ایک دو سال میں پڑھانے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ پانچویں جماعت میں اصول حدیث کے ساتھ فقہ الحدیث' نقد الحدیث اور اس سے اگلی جماعت میں سنت کی تشریعی اہمیت' تاریخ' تدوین حدیث' علم اسماء الرجال بھی پڑھایا جائے۔

علوم القرآن

تمام علوم کی تدریس سے مقصد اصلی کتاب اللہ کو سمجھنا ہے۔ جس قدر توجہ درکار تھی' اس قدر توجہ نہیں دی جا رہی۔

قرآن مجید کی تعلیم کے لیے جلالین' بیضاوی' فتح القدیر' ابن کثیر ترتیب کے ساتھ پڑھانے کے بجائے' عربی تعلیم کے ساتھ ساتھ آٹھ دس سال میں ہر سال توحید' احکام' اخلاق وغیرہ پر منتخب موضوعات پر مشتمل مکی یا مدنی آیات' سورتوں کا انتخاب ہر مرحلہ کے طلبہ کی ذہنی استعداد' سن و شعور کے مطابق کیا جائے۔

اصلاح نصاب میں چند مشکلات کا سامنا

۱۔ نصاب میں تبدیلی کے لیے مستقل اور مضبوط بنیادوں پر کام نہیں کیا گیا۔ اس کار عظیم کے لیے ایک مستقل ادارے کی کمی محسوس کی جا رہی ہے۔ گو اب مختلف مکاتب فکر کے ذمہ دار حضرات نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً" اہل حدیث مدارس کے لیے وفاق المدارس السلفیہ کے نام سے ایک ادارہ ہے جس نے ایک متوازن اور موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق نصاب تیار کیا ہے۔ اور بہت سے اہل حدیث مدارس میں یہ نصاب رائج ہے۔

دیوبندی مکتبہ فکر کے مدارس کا بھی اسی طرح وفاق ہے اور بریلوی مکتبہ فکر کے مدارس کا بھی۔

لیکن سب سے زیادہ تبدیلیاں اہل حدیث مدارس کے وفاق نے کی ہیں۔ اس لیے ان کا نصاب تعلیم موجودہ دینی مدارس کے نصابوں میں سے سب سے بہترین نصاب قرار دیا جا سکتا ہے۔

جبکہ دیوبندی اور بریلوی مدارس کا نصاب وہی پرانا درس نظامی ہے جو کہ چند تبدیلیوں اور اضافوں کے ساتھ رائج ہے۔

۲۔ دوسری بڑی مشکل جدید علوم اور مسائل حاضرہ سے متعلق کتب کا فقدان ہے۔ عام طور پر مدارس میں اردو اور عربی زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں کسی بھی فن پر لکھی گئی کتاب کو شامل نصاب کرنا غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان کتابوں کا ترجمہ کر کے کسی فن کی معلومات کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ اہم کام باہمی اشتراک اور تعاون ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

کیا آٹھ سالہ نصاب تعلیم طویل ہے؟

دینی مدارس میں مدت تعلیم کے لیے مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔

۱۔ مدت تعلیم آٹھ سال سے بڑھا کر نو سال کر دی جائے تاکہ مدرسے سے فارغ ہونے والا طالب علم ایم اے، بی اے کے برابر ہو جائے۔ (تعلیمی لحاظ سے)

۲۔ مدت تعلیم آٹھ سال ہی کافی ہے۔

۳۔ مدت تعلیم پانچ سال کر دی جائے۔

۴۔ حصول تعلیم کی مدت میں تعین ضروری نہیں ہے۔

مدت تعلیم کے تعین سے پہلے چند باتیں غور طلب ہیں۔ طالب علم کی اہلیت۔ داخلہ کے وقت عمر۔ گو بعض مدارس میں مڈل پاس یا پرائمری حافظ قرآن ہونا ضروری ہے جبکہ اس پر بھی سختی سے عمل نہیں کیا جاتا۔ جب تک داخلے کی عمر کا تعین نہیں ہوتا، اس وقت تک مدت تعلیم میں کمی یا زیادتی مشکل ہے۔ اس وقت تک مدت تعلیم کا تعین کافی دشوار ہے۔ عملی طور پر یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ اکثر مدارس میں بغیر کسی اہلیت کے طلبہ کو داخلہ دے دیا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے۔

بعض اوقات ایسے طالب علم داخلے کے لیے آتے ہیں، جنہوں نے صرف سادہ ناظرہ قرآن مجید پڑھا ہوتا ہے۔ ان کو بھی ابتدائی جماعت میں داخلہ دے دیا جاتا ہے جس جماعت میں ایک میٹرک، ایف اے پاس لڑکے کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ ان دونوں کی عمر میں بھی واضح فرق ہوتا ہے اور اہلیت میں بھی۔ یہ دونوں لڑکے جب فارغ ہوتے ہیں تو ان دونوں کی عمر میں نمایاں فرق ہوتا ہے تو پھر دونوں کو اس "سند" کی بنیاد پر کس طرح ایک ہی درجہ میں رکھا جا سکتا ہے؟ اس لیے داخلے کے لیے تعلیم کی اہلیت کے ساتھ ساتھ عمر کا تعین بھی ضروری ہے۔

دینی مدارس کے معیار تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے چند تجاویز

درس نظامی کے ساتھ موزوں حد تک جدید مضامین کا اضافہ کیا جائے۔ اس تبدیلی سے مدت تعلیم کی تقسیم بھی آسان ہو جائے گی۔

درجہ ابتدائیہ: پرائمری میں ابتدائی دینی تعلیم کے ساتھ اردو، حساب، معاشرتی علوم، جنرل سائنس پڑھائی جائے۔ اس کی مدت پانچ سال ہو۔

درجہ متوسطہ: اس کی مدت دو سال ہو۔

درجہ ثانویہ: اس کی مدت بھی دو سال ہو۔

درجہ تخصص: مدت دو سال۔

مذکورہ تقسیم اور درجہ بندی پر عمل کو آسان بنانے کے لیے ہر دینی مدرسے کے ساتھ پرائمری درجہ تک سکول قائم کیے جائیں۔ اس مرحلہ تک نصاب تعلیم میں فرق بالکل ختم کر دیا جائے۔ البتہ دینی مدارس کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اپنی ضروریات کے مطابق تبدیلیاں کر سکیں۔

ان مراحل میں دینی مدارس اپنی صوابدید پر سائنس، ریاضی اور عمرانی علوم کے مضامین شامل کر سکیں۔

اس سلسلے میں سب سے بڑی مشکل پیش آتی ہے کہ طالب علم کی مدرسے میں مدت قیام یقینی نہیں ہوتی۔ اس لیے بعض اوقات بہتر مستقبل کی تلاش میں تعلیمی سلسلہ کو چھوڑ دیتا ہے۔

داخلہ کے خواہش مند طلبہ میں چونکہ عمر اور تعلیم کا فرق ہوتا ہے اس لیے اس مشکل کے پیش نظر مختلف مراحل کے لیے مختلف کورسز شروع کیے جائیں۔ ہر کورس (نصاب) کی

مدت تعلیم مختلف ہو۔ آنے والے ہر طالب علم سے داخلے کے وقت پوچھ لیا جائے کہ وہ کس کورس میں داخلہ لینا چاہتا ہے۔

ان تمام کورسز میں داخلے سے پہلے ایک مرحلہ ابتدائیہ ایسا ہو جس مرحلہ سے ہر طالب علم گزرے جو کسی بھی کورس سے داخلہ لینا چاہتا ہے۔

دنیاوی علوم میں کسی بھی شعبہ میں تخصص کے لیے کم از کم مدت تعلیم سولہ سال ہے۔ تب کہیں جا کر طالب علم کو ایم اے کے برابر ڈگری دی جاتی ہے۔ مدارس کی سند کو ایک نوٹیفکیشن کے ذریعے ایم اے کے برابر قرار دیا گیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آٹھ سالہ مدارس کی مدت تعلیم بہت کم نظر آتی ہے۔ اس لیے دینی مدارس کی تعلیمی مدت کا موازنہ دنیاوی تعلیم کے ساتھ درست نہیں۔ دنیاوی تعلیم میں تخصص کے لیے ایک طالب علم کو کم از کم مڈل تک عمومی تعلیم دی جاتی ہے اور سب کے لیے ایک ہی تعلیمی نصاب ہوتا ہے۔ میٹرک سے تخصص شروع ہو جاتا ہے۔ میٹرک سائنس کے ساتھ اور جنرل سائنس کے ساتھ' انٹر میں میڈیکل' نان میڈیکل اور آرٹس گروپ بن جاتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ بی اے تک جاری رہتا ہے اور تمام گروپ ایک ہی تعلیمی ادارے میں زیر تعلیم ہوتے ہیں لیکن شعبے اور کورسز مختلف۔ دنیاوی علوم و فنون کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ کثرت علوم و فنون اس بات کی متقاضی ہے کہ ہر شعبے کے لیے ایک تخصص جدا جدا ہو۔ مثلاً" ڈاکٹر' انجینئر' اکاؤنٹنٹ وغیرہ۔ جب کہ دینی مدارس میں اس قدر شعبوں کی تقسیم ممکن نہیں۔ مدرسے سے فارغ ہونے والا طالب علم بیک وقت خطیب' عالم' مبلغ' مدرس اور امام ہوتا ہے۔ مدرسے کی تعلیم میں اس قدر تنوع اور جامعیت ہے اور یہ مطلوبہ استعداد پیدا کرنے کے لیے بعض اوقات آٹھ سالہ کورس بھی کم نظر آتا ہے۔ گو ان مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے طالب علموں کی اہلیت اور قابلیت مختلف ہوتی ہے مگر ان کو یہ سب کام کرنے پڑتے ہیں کیوں کہ یہ ہماری معاشرتی اور دینی ضرورت ہے۔

دوسرا مسئلہ امت مسلمہ کو صالح قیادت اور فراہم کرنا بھی ان مدارس کی ذمہ داری ہے۔ ایسے لوگوں کو تیار کرنے کے لیے یقیناً آٹھ سال کی مدت کافی ہے۔ جب کہ عام دینی ضرورتوں اور تقاضوں کے لیے آٹھ سالہ کورس میں بھی کمی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً"

۱۔ امام کے لیے علیحدہ کورس

۲۔ خطیب کے لیے کورس

۳۔ مبلغ' داعی اور مدرس کے لیے کورس

ایک ابتدائی مرحلہ دو سالہ جس میں عمومی علوم دینیہ پڑھائے جائیں۔ اس کے بعد تین سالہ یا چار سالہ کورس میں تخصص ہو۔

طلبہ میں تحقیقی صلاحیت کیوں پیدا نہیں ہوتی؟

دینی مدارس میں داخلہ ہونے والے طلبہ کی اکثریت ایسے لڑکوں پر مشتمل ہوتی ہے جو شعوری طور پر مدرسے میں داخلہ نہیں لیے ہوتے۔ کئی مجبوریوں' معاشی تنگی و مشکلات کی وجہ سے دینی مدارس کا رخ کرتے ہیں۔ اور ان میں اکثریت چھوٹی عمر کے طلبہ کی ہوتی ہے۔

داخلے کے لیے عمر اور تعلیم کی شرط لگا دی جائے تا کہ جو طالب علم یہ راستہ اختیار کرے' وہ فطری لگاؤ اور دلی رجحان رکھتا ہو اور پورے شعور کے ساتھ اس میدان میں قدم رکھے اور وہ دین کو اور دینی تعلیم کو ایک مشنری جذبے کے ساتھ پڑھے نہ کہ معاشی ضرورت پوری کرنے کے لیے تا کہ معاشرے سے یہ تاثر ختم ہو کہ جس کو کوئی اور کام نہیں آتا یا کوئی کام نہیں ملتا' وہ دینی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دیتا ہے۔

عمر کی شرط اور تعلیمی اہلیت کی شرط سے معیار بلند کرنے میں مدد دے گی۔ گو اس سے مدارس میں طلبہ کی تعداد میں کمی واقع ہوگی' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ تعلیمی کورس اور تعلیمی مدت پوری کرنے کے بعد کوئی مثالی عالم پیدا نہیں ہوتا۔ ہزاروں کی تعداد میں ایسے لوگ پیدا کرنے سے بہتر ہے کہ چند ایسے عالم پیدا کیے جائیں جو صحیح معنوں میں عالم دین کہلانے کے حقدار ہوں۔

یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب پڑھنے والا اخلاص اور مشنری جذبے سے پڑھے اور اس کی سوچ مادی نہ ہو۔ کیوں کہ ایسی سوچ رکھنے والا مدرسے کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کالج و یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کر کے اعلیٰ ملازمت کے حصول میں لگ جاتا ہے۔

طلبہ میں تحقیقی ذہن پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ علم الکلام سے ناواقف طلبہ کو جدید علم الکلام کی تعلیم دی جائے اور عقائد کی توضیح کے ساتھ سائنٹفک اور عقلی طریقہ استدلال استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

چونکہ طلبہ میں کسی بین الاقوامی مسئلہ اور مذاہب عالم کے موضوع پر گفتگو کرنے کی اہلیت نہیں ہوتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ بڑی جماعتوں میں مذاہب قدیم وجدید' عقلی مناہج' آداب حوار و مباحثہ و مناقشہ سکھانے کے لیے بھی نصاب مقرر کیا جائے۔

○ ابتدائی دو سال صرف عربی تعلیم کے لیے مختص کیے جائیں۔
○ ذخیرہ الفاظ‘ ضروری قواعد سے واقفیت‘ ان کی مشق کروائی جائے۔
○ طلبہ میں قوت بیان اور وسعت نظر پیدا کرنے کے لیے خطابت‘ انشاء اور ترجمہ کی مشق کے ساتھ ساتھ طلبہ میں انعامی مقابلے کروائے جائیں۔
○ مختلف تعلیمی سفر کروائے جائیں۔ علمی و ثقافتی مراکز‘ تاریخی مقامات کی سیر کروائی جائے۔
○ حالات حاضرہ سے واقفیت کے لیے جدید ذرائع ابلاغ سے ممکنہ حد تک استفادہ کیا جائے‘ مثلاً" دنیا کے بڑے بڑے مفکرین کے مختلف موضوعات پر ویڈیو لیکچرز سنائے جائیں۔

سیمینار کروائے جائیں

جدید علوم‘ نئے مسائل اور تازہ موضوعات پر قرآن و حدیث کی روشنی میں مختلف مقالے پیش کیے جائیں۔ اس کا طریقہ یہ ہو۔

۱۔ موضوع کا تعین مثلاً" تجارت کا نظام‘ تقسیط (قسطوں پر خرید و فروخت کرنا) انشورنس‘ بنکاری نظام وغیرہ۔

۲۔ لیک خاص فکر کے لوگوں کے بجائے مختلف فکر کے لوگوں کو دعوت دی جائے۔

اس مسئلے میں وسعت نظر کا مظاہرہ کرتے ہوئے مخالف نقطہ نظر رکھنے والے شخص کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا جائے تا کہ طلبہ اس کی باتیں سن کر تقابل کر سکیں، اور وہ شخص بذات خود بھی قرآن وحدیث کی روشنی میں اس موضوع پر گفتگو سن سکے۔

۳۔ مختلف مجلات اور رسائل کا مطالعہ کرنا۔ روزناموں (اخبارات) کا مطالعہ کرنا۔

۴۔ وقتاً" فوقتاً" طلبہ سے مختلف جدید موضوعات پر مضامین لکھوانا اور اس میں اول‘ دوم اور سوم آنے والے طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے انعامات دینا۔

۵۔ مدرسے میں ایک اچھی لائبریری کا قیام اور طلبہ کی رہنمائی کے لیے ایک ایسے مربی اور استاذ کا ہونا جو ان کی رہنمائی کرے کہ کون سی کتابیں ان کے مطالعے کے لیے مفید ہیں۔

۶۔ غیر نصابی کتب کا مطالعہ کرنا۔ غیر نصابی کتابوں میں کون سی کتابیں مفید ہیں۔ کیونکہ صرف علمی اور درسی کتابیں پڑھنے سے طلبہ کے اندر علمی اور تحقیقی کام کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔

عصری علوم پڑھائے جانے کے باوجود

بعض اوقات عصری علوم پڑھائے جانے اور شامل نصاب کیے جانے کے باوجود طلبہ

میں مطلوبہ استعداد پیدا نہیں ہوتی جس طرح کی استعداد اور خود اعتمادی دنیاوی مدارس کے طلبہ میں ہوتی ہے۔ چونکہ دینی مدارس میں آنے والے طلبہ کی اکثریت نادار، غریب اور پسماندہ علاقوں سے ہوتی ہے جبکہ شہری علاقوں سے دینی مدارس میں آنے والے طلبہ کی تعداد تقریباً" نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایسے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ میں ذہنی پسماندگی اور پستی کا احساس نمایاں رہتا ہے۔ نتیجتاً" وہ دین کو ذریعہ معاش بنا لیتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے تو پھر ایسی دینی تعلیم کا کیا فائدہ جو طلبہ کے اندر تبدیلی پیدا نہ کر سکے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی سوچ اور رویے میں تبدیلی، اخلاق و کردار میں بلندی کا تعلق نظام تعلیم اور تبدیلی نظام سے نہیں ہے بلکہ اس مقصد کے حصول کے لیے ایسے استاد اور مربی کی ضرورت ہے جو طلبہ کے اندر تبدیلی پیدا کر دے اور وہ دین اور دعوت دین کو بطور پیشہ نہ اپنائے بلکہ اس کو ایک مشن اور ایک فریضہ سمجھ کر اس میدان میں اترے اور اس میدان میں پیش آنے والی ہر تنگی اور مشکل پر صبر کرے۔ تب وہ ایک مثالی داعی، صحیح مبلغ دین کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ ایسے افراد سے کسی عظیم کام اور انقلاب کی توقع کی جا سکتی ہے۔ صرف تبدیلی نصاب سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں آدمی، آدمی بناتے ہیں

(اکبر)

ورنہ جس قدر سہولتیں اور حصول تعلیم کے بہترین مواقع آج ہیں، اس سے پہلے قدیم زمانے میں نہ تھے۔ اس کی سب سے عمدہ مثال اصحاب صفہ کی ہے۔ نبی علیہ السلام نے ان میں علم و عمل کی اہمیت کو اجاگر کر دیا۔ اور یہی جماعت روئے زمین پر بننے والی پہلی اسلامی سلطنت کے وزیر و مشیر اور جرنل بنے۔

وحدت نظام تعلیم

ایک صدی سے دینی مدارس میں قدیم و جدید کے امتزاج یا وحدت نظام تعلیم کی کوشش ہو رہی ہیں اور بہت سے مدارس میں تجرباتی طور پر یہ نظام رائج کیا گیا اور اس کے حوصلہ افزا نتائج نکلے مگر اس کا زیادہ تر نقصان دینی مدارس کے تشخص پر پڑا اور متوقع معیار کے علماء پیدا نہ ہوئے جب کہ علماء کا میدان خاص ہے۔

بہتر یہ ہے کہ جن دینی مدارس میں عصری علوم کو پڑھانے کا اعلیٰ انتظام ہے اور ان کا معیار تعلیم سکول و کالج کے برابر ہے، ان مدارس میں عصری علوم کی تعلیم کا سلسلہ جاری

رکھا جائے۔ مگر وہ مدارس جن میں علوم عصریہ پڑھانے کا معقول بندوبست نہیں' ان مدارس کے طلبہ کو یکسوئی کے ساتھ دینی علوم حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔ ان میں سے اگر کوئی طالب علم عصری علوم پڑھنا چاہتا ہے تو وہ محدود مدت کے کورسز میں داخلہ لے کر یہ کمی پوری کر لے۔

فراغت کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے عرب ممالک کی جامعات میں داخلے کی کوشش مستحسن اقدام ہے۔ طلبہ کو مختلف نصاب' مناہج اور اسالیب تعلیم سے واسطہ پڑتا ہے۔ طریقہ تدریس مختلف ہونے کی وجہ سے مزید استفادے کا موقعہ ملتا ہے۔ ان حاصل کردہ مفید معلومات کی روشنی میں یہاں کے مدارس میں نصاب تعلیم کو جدید خطوط اور مناہج تعلیم کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے اور اس میں مفید تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔

برصغیر میں حالات و واقعات کی تبدیلی کے تناظر میں دینی مدارس کی اصلاح' نظام تعلیم اور تبدیلی نصاب کی طرف توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ اگر اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور نہ کیا گیا اور مثبت تبدیلیوں کے لیے مناسب اقدامات نہ کیے گئے تو عین ممکن ہے کہ دینی مدارس اس تیز رفتار ترقی اور بدلتے ہوئے حالات و واقعات کا مقابلہ نہ کر سکیں اور بہت سے دوسرے ممالک کی طرح برصغیر میں بھی مدارس کا وجود موجودہ شکل میں برقرار رکھنا مشکل ہو جائے۔

معیاری علماء کے پیدا نہ ہونے کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب

۱۔ روحانی تعلیم کی کمی۔

۲۔ تزکیہ نفس پر خصوصی توجہ کا نہ ہونا یا اس کا غیر اہم سمجھنا۔

موجودہ علمی انحطاط اور قحط الرجال کے دور میں بھی آپ کو بہت سے ایسے مدرس' عالم دین' خطیب اور امام مل جائیں گے جو اپنی اپنی جگہ فن کے لحاظ سے بڑے ماہر ہوتے ہیں اور موجودہ دور کے تمام تقاضے پورے کر رہے ہوتے ہیں۔ اور ایسے علماء بھی موجود ہیں جو آپ کے جملہ سوالات و اعتراضات کا تسلی بخش اور مسکت جواب دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ عقلی و نقلی دلائل کی روشنی میں آپ کو مطمئن کر سکتے ہیں۔ مگر اس مطلوبہ معیار پر پورا اترنے کے باوجود سامعین یا مخاطبین پر نہ تو ان کی گفتگو کا کوئی اثر ہوتا ہے اور نہ ان میں اندرونی و بیرونی طور پر کوئی انقلاب ہی برپا ہوتا ہے۔ اس کی مثال بعض اسلامی ممالک میں آپ کو بہت سے ایسے ماہر تعلیم استاد و مدرس ملیں گے جو مختلف فنون میں مہارت تامہ

رکھتے ہیں مگر ان کی ذات' شخصیت روحانیت سے خالی ہونے کی وجہ سے ان کو دیکھ کر ذہن میں کسی عالم دین کا تصور تک نہیں آتا ہے۔ اور ان کی عملی زندگی ان کی بہترین گفتگو' مربوط لیکچر اور وعظ کے بالکل برعکس اور خلاف ہوتی ہے اور ان کے شب و روز کے افعال و اعمال سے ان نظریات اور عقائد کی سراسر نفی ہوتی ہے جن افکار و نظریات کو مسند استاد پر بیٹھ کر بیان کرتے ہیں۔

آج آپ کو شاندار نظام تعلیم اور معیاری نصاب تعلیم سے آراستہ بہترین درس گاہیں اور عالی شان عمارتیں مل جائیں گی۔ مگر ان میں ابن تیمیہؒ' ابن قیمؒ' امام غزالیؒ' ابن کثیرؒ اور ابن حجرؒ' شاہ ولی اللہؒ' نواب صدیق حسنؒ' سید نذیر حسین دہلویؒ جیسی نامور علمی ہستیاں پیدا نہ ہو سکیں۔ قدیم اور جدید دور کے علماء میں نمایاں فرق نظر آئے گا' وہاں ہمیں روحانیت' تزکیہ نفس کا اہتمام بھی نظر آتا ہے اور یہاں فقط عالی شان بلند و بالا عمارتیں اور بہترین مرتب نصاب تعلیم۔

اختلافی مسائل ----- صحیح رہنمائی

قدیم فقہاء کے ارشادات و تفصیلات پر قناعت کرنے سے فقہی مسائل میں بصیرت پیدا نہیں ہوتی۔ اس لیے جدید اضافوں و اجتہادات کی ضرورت ہے۔ اس جدید اضافے کے بغیر قدیم نصاب (مقررات) عبادات کے مسائل و احکام میں مفید ہونے کے باوجود دیگر مسائل میں غیر مفید اور ناقص ہے۔

چونکہ ہمارے ملک کی اکثریت مسلکاً فقہ حنفی سے تعلق رکھتی ہے' لوگوں کو فقہ کا علم ہو یا نہ ہو' وہ مسائل سے واقف ہوں یا نہ ہوں' ان کا عمل عموماً فقہ حنفی کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں کے مدارس میں فقہ حنفی کی باقاعدہ تعلیم مفید ہے۔ تاکہ علماء کے لیے عام آدمی کو فقہ السنہ اور فقہ حنفی میں تقابل کر کے مسائل سمجھانے میں آسانی ہو۔

اختلافی مسائل کی تعلیم اور ان پر سیر حاصل بحث کے بعد اگر ایک طالب علم کی صحیح رہنمائی کر دی جائے اور اس کو یہ بات ذہن نشین کروا دی جائے کہ کس طرح اس مفید ہتھیار کو بوقت ضرورت استعمال کرنا ہے۔ اختلافی مسائل پر دلائل کو کب اور کن حالات میں استعمال میں لانا ہے۔ اس کی افادیت اور اغراض و مقاصد کا تعین کر دیا جائے تو اس کے بہترین نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اس بات کی ضرورت کیوں؟

اگر آج کوئی دینی و فروعی مسائل کے وسیع تر مفہوم اور ان کی شرعی حیثیت کو ذہن میں رکھتا ہو اور اسلام کی خدمت کے سچے جذبے سے سرشار ہو اور وہ اختلافی مسائل پر بحث و مباحثہ کو نقصان دہ سمجھتا ہو تو اس کا یہ جذبہ اور درد قابل قدر ہے مگر یہ سوچ تو یک طرفہ ہے اور ایک فریق یا ایک شخص کے نیک جذبات ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے فریق ثانی کی طرف سے جب لوگوں میں کتاب وسنت اور خاص طور پر حدیث کے بارے میں غلط قسم کے شکوک و شبہات پھیلائے جاتے ہوں اور عاملین بالحدیث والسنہ کے بارے میں نفرت کا اظہار کیا جاتا ہو تو ایسی صورت حال میں نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کو سنت نبویؐ کو زندہ کرنے اور حدیث کی حفاظت کے لیے دفاع کرنا ہوگا۔ بلکہ بعض اوقات یہ کام فرض ہو جاتا ہے تو ایسی صورت حال میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اختلافی مسائل کو افہام و تفہیم کی حد سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے اور اس کو ذاتی بے عزتی' ہار جیت اور انا کا مسئلہ نہ بنایا جائے۔

خاص طور پر وہ مسائل جن میں قدیم زمانہ سے اختلاف چلا آرہا ہے۔ اس اختلاف کی بنیاد پر کسی مسئلہ پر عمل پیرا اور عمل نہ کرنے والے شخص معین کے بارے میں حکم لگنا' فتویٰ لگانا اور نازیبا الفاظ کا استعمال نامناسب اور ناپسندیدہ فعل ہے۔ سلف کے ہاں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اختلافات میں شدت کی بناء پر ایک دوسرے کے عمل کو باطل اور کفر گرداننے سے پرہیز ضروری ہے۔

فقہ کی تعلیم کیسے اور کس حد تک ہونی چاہیے؟

فقہی بصیرت پیدا کرنے کے لیے فقہی مقررات (منتخب نصاب) کے ساتھ اصول الفقہ' قواعد فقہیہ' تاریخ فقہ اسلامی' اسباب اختلاف فقہاء "الاوضاع التشریعیة فی العالم الاسلامی" عقود وملکیت کے متعلقہ قوانین' بین الاقوامی قوانین کا مطالعہ' فقہ الدولہ (نظام حکومت) جدید اصطلاحات سے مطابقت پیدا کر کے فقہ کو جدید بنایا جائے۔

اس کے لیے عائلی قوانین (پرسنل لاء) حدود و تعزیرات' قصاص و دیت کے قانون کو آج کل کی اصطلاحات کی روشنی میں سمجھا جائے۔ ان کی تعریفیں' مفاہیم اور معانی کی جدید الفاظ سے تشریح و توضیح کی جائے۔ اس طرح "فقہ السنہ" کے بارے میں لوگوں کا تصور واضح ہوگا اور فقہ اور فقہی مسائل جتنے قدیم زمانے میں مفید تھے' اتنے ہی آج بھی مفید' قابل عمل اور قابل استفادہ ہیں۔

فقہ کے مقررات

خواہ فقہ حنفی ہو' فقہ السنہ' فقہ المذاہب ان کے مقررات پڑھائے جائیں۔

چونکہ دعوت دین کا کام کرنے والے کے مخاطبین تمام طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں' اس لیے دینی علوم میں مہارت کے ساتھ علوم عصریہ' معلومات عامہ سے مناسب واقفیت ضروری ہے۔

آج کا مسلمان دین کے بارے میں بدظن ہو چکا ہے۔ وہ دین کو ایمانیات اور عقائد کی بحثوں سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ اجتماعی معاملات میں اس کی مداخلت قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔

ہمارے نزدیک مغربی یلغار کے مقابلے سے علماء اسلام کی اس بے اعتنائی اور بے پروائی کی بنیادی وجہ دینی مدارس کا نصاب تعلیم ہے۔ ان کو فقہ حنفی تو خوب پڑھائی جاتی ہے لیکن دوسری فقہوں کی تدریس کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ وہ بھی اسلامی فقہ ہی کا حصہ ہے۔

حدود وتعزیرات کے بارے میں اعتراضات وسوالات سے واقفیت ضروری ہے۔ آج کل عقائد وایمانیات کے بجائے قوانین وشرائع کو ہدف تنقید بنایا جا رہا ہے۔ پچھلے پچاس سال میں معاشرت' معیشت' سیاست' حدود وتعزیرات' غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کے نقطہ نظر کو ہدف تنقید بنایا جا رہا ہے۔ تعدد ازدواج' طلاق' غلامی' مساوات مرد وزن' سود' انشورنس' سٹہ بازی' جمہوریت' بنیادی حقوق' سزاؤں اور بے شمار دوسرے معاملات پر اسلام کے نقطہ ہائے نظر کو غلط قرار دینے کی کوشش کی گئی۔

ان تمام مسائل کے بارے میں فقہ کے قدیم کی روشنی میں جدید اصطلاحات کا اضافہ ضروری ہے۔

(بہ شکریہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور)

مولانا محمد عیسیٰ منصوری

دینی مدارس میں معیار تعلیم کا مسئلہ

ہمارے جامعات میں ایک بہت بڑی کوتاہی یہ ہو رہی ہے کہ جو بھی طالب علم ہمارے جامعات کا رخ کرے' خواہ اس میں استعداد ہو یا نہ ہو' ذوق و شوق ہو یا نہ ہو' اسے عالم بنانا ہم نے اپنے اوپر فرض کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے ایسے علماء فارغ ہونے لگے جو عربی تو کجا' چند سطریں اردو صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ خطبات جمعہ کو خبتات جما لکھتے ہیں۔ چنانچہ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم دارالحدیث جامعہ رحمانیہ مونگیر زیر صدارت مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار علماء و طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے' ہیں:

"اس کا سب سے زیادہ تجربہ تو ہمارے مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کو ہوگا۔ وہ دیوبند میں دیکھتے رہتے ہیں' ندوہ میں دیکھتے رہتے ہیں۔ دونوں جگہ کے وہ اہم بنیادی رکن ہیں کہ کس طرح کے فضلاء نکل رہے ہیں۔ دورہ کا امتحان لینے کے لیے لوگ گئے اور معلوم ہوا کہ عبارت صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ پہلی حدیث انما الاعمال بالنیات و انما لکل امری ما نوی ہی کو غلط پڑھا اور ترجمہ بھی غلط کیا۔ اسی طرح کے فضلاء مسلسل ادھر کئی سال سے نکل رہے ہیں۔ میرے خیال میں کوئی بیس پچیس سال سے یہ انحطاط نمایاں طریقہ پر شروع ہو گیا ہے" (ص ۲۴۷' پا جا سراغ زندگی)

اس تقریر میں مولانا آگے فرماتے ہیں:

"آج ہمارے مدارس میں اس وقت جو سب سے بڑا مسئلہ ہے جس کو کرائس (RISIS) (بحران) کہنا چاہیے' وہ ہے مدرس کا مسئلہ۔ آج مدرس نہیں مل رہے ہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اتنی بڑی درس گاہ لیے بیٹھے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں دو تین مدرس بعض فنون کے مل جائیں' وہ نہیں مل رہے ہیں اور دیوبند کو اس وقت شیخ الحدیث نہیں مل رہا ہے۔ اب یہ بات آپ کے لیے ہمارے لیے راز کی نہیں رہی کہ دیوبند میں شیخ الحدیث کا مسئلہ مناسب طریقہ پر حل نہیں ہو سکا۔ آج مولانا منت اللہ صاحب اس کے رکن رکین ہیں اور وہ خاص کمیٹی جس نے یہ فیصلہ کیا ہے' اس میں وہ شریک ہیں لیکن

وہ بھی مطمئن نہیں ہیں، میں بھی مطمئن نہیں ہوں، کوئی مطمئن نہیں۔ یعنی جو دارالعلوم کی روایت تھی، جو دارالعلوم کا معیار تھا، اس کے مطابق ابھی مسئلہ حل طلب ہے" (ص ۱۷۰)

آزادی کے بعد مدارس اور جامعات کی تعداد دس گنا بڑھ گئی۔ عرصہ سے زیادہ توجہ افراد سازی کے بجائے افراد شماری اور شاندار عمارتوں پر ہے جس کی وجہ سے علم اور علماء کی عزت وحرمت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ اگر اس مسئلہ پر فوری توجہ نہیں دی گئی تو خاکم بدہن علماء کی رہی سہی عزت و احترام بھی رخصت سمجھئے۔ سچی بات یہ ہے کہ بہت سے والدین اپنے ایک دو بچوں کو اس لیے دینی مدارس میں روانہ کر دیتے ہیں کہ بچہ مفت میں ۸۔۱۰ سال پل جائے گا اور اس قابل ہو جائے گا کہ کم از کم اپنا پیٹ پال سکے گا اور خود بچہ کا شعوری طور پر علم حاصل کرنے کا ارادہ نہیں ہوتا۔ وہ حالات کے جبر کے تحت آ جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے جیسی روح ویسے فرشتے، جیسے نیت ویسے اثرات۔ ایسے حالات میں یہ طے کرنا کہ بچہ میں مکمل عالم بننے کی اہلیت ہے یا نہیں، یہ فیصلہ والدین یا بچہ پر نہیں چھوڑا جا سکتا بلکہ طلباء کی استعداد کا جائزہ لے کر ہمارے دینی مدارس کو طے کرنا ہوگا کہ بچہ کو عالم بنایا جائے یا دینیات کا مختصر کورس کرا کر فارغ کر دیا جائے۔ ایسے بچوں کے لیے ۳ سالہ مختصر کورس بنایا جا سکتا ہے جس میں قرآن کی تصحیح، تجوید قرآن، ضروری فقہی مسائل (مادری زبان میں)، سیرت وتاریخ، جمعہ ونکاح کے خطبات اور مکتب میں پڑھانے کی تمرین ہو۔ ہمارے ۹۵ فی صد علماء کو بچوں کی مکتبی تعلیم اور امامت ہی کرنی ہوتی ہے۔ محض اس کام کے لیے ان کی زندگی کے ۸۔۹ سال کا عرصہ اور ملت کے کروڑہا کروڑ روپے صرف کرنا وقت اور مال دونوں کا ضیاع ہے البتہ جو ذی استعداد طلباء ہیں اور پڑھنے کا ذوق وشوق بھی رکھتے ہیں، ان کے لیے نصاب تعلیم بجائے ۸ کے ۱۰ سال بھی کیا جا سکتا ہے (اگر ایم اے کرنے کے لیے ۱۴ سال لگتے ہیں تو مکمل عالم کے لیے ۱۰ سال زیادہ نہیں ہیں) اس طرح خواہ ایک طالب علم پر ۴۔۵ طالب علم کے اخراجات ہو جائیں مگر دس بیس باصلاحیت علماء کسی ادارے سے فارغ ہوں تو وہ موجودہ پانچ سو، ہزار علماء سے بہتر نتائج پیدا کریں گے۔ بدقسمتی سے دین کے دیگر شعبوں کی طرح تعلیم وتعلم کے شعبہ میں بھی کالی بھیڑیں گھس آئی ہیں کیونکہ اس دور میں دینی جامعات اپنے علاقہ اور قوم پر ایک طرح کی ریاست اور اقتدار کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ اب تو یہ بات عوام کی زبان پر بھی آ گئی ہے کہ سلاً" بعد نسل جاگیریں بن رہی ہیں۔ بندہ نے خود اپنے کانوں سے کئی جامعات کے ذمہ داروں کو چندہ لیتے وقت علاقائی، ضلعی اور برادری کی عصبیت اپناتے سنا ہے۔ ضلعی وقومی عصبیت کے نام پر مالی

اپیل کرتے سنا ہے۔ یہ مسئلہ بھی ضروری توجہ کا متقاضی ہے۔ دینی مدارس میں زیادہ توجہ تعمیر عمارات پر ہے۔

یہ مزاج اتنا ترقی پذیر ہے کہ بڑے بڑے اہل علم' جب خدا نے انہیں مالی وسائل فراہم کیے تو انہوں نے اپنے گاؤں میں ۵-۵ کروڑ کا دارالعلوم کھڑا کیا۔ ان کی طبیعت بھی علمی اوارے' ریسرچ و تحقیق' تصنیف و تالیف' نشرواشاعت کی طرف نہیں چلتی حالانکہ اس دور میں ان اداروں کی ہی اشد ضرورت ہے۔ انڈیا گجرات کے صرف دو اضلاع سورت اور بھروچ میں گزشتہ ربع صدی کے عرصہ میں ۳ - ۴ درجن کے قریب دو دو میل کے فاصلے پر بڑے بڑے جامعات قائم ہو گئے ہیں۔ ایسے جامعات سے علم کے بجائے جاہلیت پھیلتی ہے۔ یاد رہے جہالت نام ہے نہ جاننے کا اور جاہلیت جان کر نہ ماننے کا۔ اگر ٹھوس علمی کام کا جائزہ لیا جائے تو گزشتہ ربع صدی میں ان جامعات سے کوئی ایک بھی علمی تحقیقی کتاب یا تصنیف نہیں نکلی جسے امتیازی طور پیش کیا جا سکے اور جس قسم کے مولانا فارغ ہو رہے ہیں' ان کا حال یہ ہے کہ وہ درپیش کسی عصری مسئلہ پر نہ چند منٹ بول سکتے ہیں نہ چند سطریں لکھ سکتے ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ملت کے مال کا بہت بڑا حصہ عمارتوں پر خرچ ہو رہا ہے۔ جامعات میں مسجد کی تعمیر پر ۲۰-۳۰ لاکھ تو آسانی سے خرچ کر دیے جاتے ہیں مگر انہی جامعات کے مدرسین کو اتنی تنخواہ نہیں دی جاتی کہ بسہولت ان کا گزر بسر ہو سکے۔ بہت سی جگہوں پر اساتذہ کرام کی تنخواہوں کا معیار پرائمری اسکول کے ٹیچروں کی تنخواہ سے بھی پست ہے۔ زکوۃ و صدقات کا اصل قرآنی مصرف انسان کی بنیادی ضروریات ہیں۔ یہی آنحضرت ﷺ کی سیرت سے بھی نمایاں ہے۔ ہم لاکھوں فقراء و مساکین' بیماروں اور بیواؤں کا حق مار کر عالی شان عمارتوں میں حیلہ کر کر کے لگا رہے ہیں۔ ظاہری شان و شوکت پر پانی کی طرح روپیہ بہایا جا رہا ہے۔ جبکہ لاکھوں مسلمان افریقی ممالک میں بھوک سے مر گئے' لاکھوں بیمار مسلمانوں کے پاس دوا اور علاج اور آپریشن کے لیے پیسے نہیں' لاکھوں مسلمان بچیاں شادی کے اخراجات نہ ہونے کی وجہ سے بن بیاہی بیٹھی ہیں۔ اس مسئلہ پر بہت زیادہ سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کس جگہ کس سائز کے مدرسہ یا جامعہ کی ضرورت ہے؟ اسے محض فرد واحد کی رائے پر نہیں چھوڑا جا سکتا' وہ بھی ایسے دور میں جب اس مقدس شعبہ میں ہر قسم کے لوگ آئے ہوں اور علم دین کے نام پر کتنے قسم کے فتنے اور تباہی سامنے ہے۔

دینی مدارس میں انحطاط کو روکنے کے لیے ضروری ہے کہ مختلف علوم و فنون میں

ماہرین تیار کرنے پر توجہ دی جائے۔ ہر بڑا دارالعلوم کسی ایک شعبہ میں تخصص کا التزام کرے۔ کسی جگہ حدیث پر ۳ سالہ تخصص ہو۔ پڑھانے کے لیے دنیا بھر میں جہاں سے دستیاب ہوں، اعلیٰ ترین ماہرین لائے جائیں۔ جس طالب علم کو حدیث میں مہارت تامہ اور کمال حاصل کرنا ہو، وہ وہاں جائے۔ اس طرح ہر دارالعلوم میں کسی ایک موضوع پر تخصص کا انتظام ہو۔ کہیں فقہ پر، کہیں تفسیر، ادب، صحافت وغیرہ وغیرہ پر اور موضوع پر اعلیٰ درجہ کا مطالعہ و تحقیق کا انتظام ہو تا کہ ایسے افراد نکلنے لگیں جو کسی ایک فن یا موضوع پر بصیرت رکھتے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے جامعات اعلیٰ ترین اور جدید ترین نشر واشاعت کے ذرائع کے ذریعہ ان کا عوام سے رابطہ ہو تا کہ زندگی میں دین کی عملی تطبیق اور معاشرہ میں شریعت کے نفاذ کی طرف قدم بقدم آگے بڑھیں جو تعلیم وتعلم کا اصل مقصد ہے۔

سہ ماہی الشریعہ گوجرنوالہ کا اکتوبر ۹۸ء کا شمارہ

ریاستہائے متحدہ امریکہ

اور

اسلامی جمہوریہ پاکستان

کے پچاس سالہ تعلقات کے جائزے کے حوالہ سے ممتاز اہل قلم کی

منتخب نگارشات پر مشتمل ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ (ادارہ)

دینی مدارس کے حوالہ سے

قومی تعلیمی کمیشن کا سوال نامہ

محترم و مکرم السلام علیکم!

حکومت پاکستان نے شریعت کے نفاذ کے لیے اپنی کاوشوں کا آغاز کر رکھا ہے۔ شریعت بل ۱۹۹۱ء کے تحت قومی تعلیمی کمیشن برائے اسلامائزیشن تشکیل دیا گیا ہے۔ اس کمیشن کی پہلی نشست ۳ ستمبر ۱۹۹۱ء کو ہوئی تھی اور ساتھ کمیٹیاں بنائی گئی تھیں۔ کمیٹی نمبر ۵ کا میں کنوینر ہوں، یہ کمیٹی دینی مدارس کے مسائل، ضروریات اور سہولتوں کے مسائل پر غور و فکر کر رہی ہے۔ دینی مدارس کے مسائل کا علم آپ کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔

آپ سے درخواست ہے کہ آپ تعلیم کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے میں کمیشن کی اعانت فرمائیں اور دینی مدارس کو کیا سہولتیں حکومت سے درکار ہیں یا ہو سکتی ہیں، اس کی وضاحت فرمادیں۔

سفارشات ۵ دسمبر سے پہلے ارسال فرمائیں۔

۱۔ دینی مدارس کو حکومت کی مالی معاونت کی ضرورت سے متعلق آپ کی تجاویز۔

۲۔ دینی مدارس کے مسائل اور ضروریات۔

۳۔ دینی مدارس کو حکومت کس طرح کی سہولتیں مہیا کرے؟

۴۔ جدید نظام تعلیم کو اسلامی خطوط پر کس طرح استوار کیا جائے؟

۵۔ دینی مدارس میں جدید علوم کو کس طرح متعارف کرایا جائے؟

۶۔ یہ بھی درخواست ہے کہ دینی مدارس اور عام مدارس کے نصاب اور نظام میں کس طرح ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں بھی اپنی تجاویز تحریر فرما دیں۔ نوازش ہوگی۔

تعاون کا پیشگی شکریہ۔ والسلام

جسٹس (ریٹائرڈ) محمد ظہور الحق
کنوینر نیشنل ایجوکیشن کونسل، اسلام آباد

وفاق المدارس العربیہ کی سفارشات

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

نفاذ شریعت اور نظام تعلیم کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے لیے حکومت کی کوشش کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں اور دل سے دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ حکومت کو اپنے ان نیک مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ پاکستان کی آزادی کو آج ۴۵ سال ہو چکے ہیں مگر مسلمان آج تک اس میں اپنا نظام تعلیم رائج نہ کر سکے۔ دنیا کے ہر ملک میں نظام تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ نظام تعلیم ہی کے ذریعے لوگوں کے نظریات، خیالات، افکار و جذبات کو بدلا جا سکتا ہے۔ آج ہمارے تعلیمی اداروں سے اچھے اخلاق اور بہتر سیرت و کردار کے حامل افراد نہیں نکل رہے ہیں اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہمارے ملک میں ابھی تک لارڈ میکالے کا نظام تعلیم رائج ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ موجودہ حکومت نے نظام تعلیم کو اسلام کے مطابق بنانے کے لیے قومی تعلیمی کمیشن برائے اسلامائزیشن تشکیل دیا ہے۔ اس کمیشن کے ساتھ ان شاء اللہ ہم ہر قسم کا تعاون کرنے کی کوشش کریں گے۔ نکات مستفسرہ کے متعلق میری سفارشات درج ذیل ہیں۔

نکات ثلاثہ (۱، ۲، ۳)

ان کے متعلق عرض ہے کہ اس کے لیے دینی مدارس کے مختلف وفاقوں سے ان کے تناسب کے مطابق چند نمبروں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جائے اور اس کمیٹی کی تجویز اور توسط سے دینی مدارس کی امداد کی جائے۔

نکتہ نمبر ۴

(۱) نظام تعلیم کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے لیے سب سے پہلے تو ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے جو اسلامی علوم میں مہارت رکھتے ہوں۔ "قوم کے بچوں کو کیا پڑھایا جائے" یہ بعد کی بات ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ پڑھائے گا کون؟ جب پڑھانے والے ہی نہ ہوں تو تعلیمی ادارے جہالت کے اڈوں میں بدل جاتے ہیں۔ اسکولوں کی تعداد بڑھانے کے بجائے ان کے معیار کو بڑھایا جائے۔ پورے ملک میں اسکولوں کی بھرمار ہے مگر معیار ندارد۔

اسلامیات پر عبور رکھنے والے جتنے اساتذہ مہیا ہوں' صرف اتنے اسکول کھولے جائیں۔

(۲) بہتر یہ ہے کہ رہائشی اسکول (RESIDIENTIAL) کھولے جائیں اور تعلیمی اوقات کو بڑھایا جائے۔ جب مواد اسلامی ہو گا تو تعلیمی اوقات کے بڑھانے سے طلباء بوجھ محسوس نہیں کریں گے۔

(۳) ذریعہ تعلیم فوری طور پر اردو کو بنایا جائے۔

(۴) اصطلاحات کا بھی ماہرین لغت سے ترجمہ کروا کر قوسین میں انگریزی نام لکھ دیا جائے تا کہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

(۵) انگریزی میٹرک تک ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے۔

(۶) زبان دانی کے لیے ماحول کا بندوبست کیا جائے جس میں رہائش کا بندوبست بھی ہو یعنی اگر کوئی انگریزی سیکھنا چاہتا ہے تو اس کو ایسا ماحول فراہم کیا جائے جہاں صرف اور صرف انگریزی بولی جاتی ہو۔ اس کے لیے ایک سال کا وقت کافی ہے۔ ماہرین تعلیم کے مشورے سے اس کا دورانیہ بڑھایا بھی جا سکتا ہے۔

(۷) پرائمری اسکولوں میں قرآن کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ شروع کے تین پیریڈ صرف ناظرہ قرآن کے لیے ہوں۔ پرائمری میں صرف چار مضامین ہوں' قرآن' اردو' حساب اور اسلامیات۔ اسلامیات میں عقائد' عبادات اور سیرت سے متعلق مواد شامل ہو۔

(۸) مشنری اسکولوں کو فوری طور پر بند کر دیا جائے۔ یہ عیسائیت کی تبلیغ کے اڈے ہیں۔ ایک تو بھاری فیسوں کے ذریعے قوم کا خون چوستے ہیں اور دوسری جانب ملکی معیشت پر بار ہیں کہ بھاری رقوم سے ان کی امداد کی جاتی ہے۔

(۹) مخلوط تعلیم کو بلا تاخیر ختم کر دیا جائے۔

(۱۰) لڑکیوں کا نصاب جداگانہ ہو' جس میں پردہ' تربیت اولاد (تعلیمی وجسمانی) اسلامی معاشرت اور عورتوں کے مخصوص مسائل کو شامل نصاب کیا جائے۔ میٹرک تک ان کو ابتدائی طب بھی سکھائی جائے۔

(۱۱) عورتوں کے نصاب سے غیر ضروری مواد کو حذف کر دیا جائے مثلاً" انگریزی' جغرافیہ' سائنس اور غیر ضروری تاریخ وغیرہ۔

(۱۲) لڑکیوں کے لیے تعلیم کا دورانیہ دس سال سے زائد نہ ہو۔ دس سال کے اختتام پر ان کو بی اے (B.A.) کے مساوی ڈگری دی جائے۔

(۱۳) محکمہ تعلیم میں بھرتی ہونے کے لیے مسلمان ہونے کی شرط لگائی جائے۔

(۱۴) تمام ایلیمنٹری کالجوں میں وفاق المدارس کا امتحان پاس کرنے والے فضلاء کو رکھا جائے۔ ان کالجوں کا نصاب وفاق المدارس خود ترتیب دے اور امتحان بھی خود لے۔ ان کالجوں میں داخلہ لینے والے اساتذہ کو ایک سال کے دوران ضروری دینی تعلیم دی جائے۔ اخراجات حکومت برداشت کرے۔ ملک کے تمام اساتذہ پر (بشمول ایس ایس اور سینئر ایس ایس ٹی) اس ٹریننگ کو لازمی قرار دیا جائے۔ اس کے امتحان میں فیل ہونے والے ان ٹرینڈ اساتذہ کو ٹرمینیٹ تصور کیا جائے۔ جو سینئر اساتذہ اس میں فیل ہوں' ان کی ترقی روک دی جائے۔ ان کالجوں میں جو اس وقت تدریسی تربیت دی جاتی ہے' اس کو تجدیدی کورسوں کے ذریعے مکمل کیا جائے اور یہ تجدیدی کورس چھٹیوں میں بھی رکھے جاسکتے ہیں۔

(۱۵) ایجوکیشن کالجوں میں "اسلامی نظام تعلیم" اور فقہ کو لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل نصاب کیا جائے۔ اور بی ایڈ میں داخلہ کے لیے تمام قرآن کا تجوید کے ساتھ پڑھنا اور عم پارہ کا حفظ ہونا شرط قرار دیا جائے۔

(۱۶) ایم ایڈ میں داخلہ کے لیے ناظرہ قرآن عم پارہ' سورہ یاسین اور سورہ ملک کا یاد ہونا شرط قرار دیا جائے۔ ایم ایڈ میں پارہ عم کی تفسیر' حدیث مع اصول اور فقہ مع اصول کو نصاب میں شامل کیا جائے۔

(۱۷) کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو گاہے گاہے مختصر المیعاد کورسز کے ذریعے اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا جائے اور اس کے لیے ملک کی بڑی دینی درس گاہوں سے دینی علوم میں مہارت تامہ رکھنے والے اساتذہ کی خدمات حاصل کی جائیں۔

(۱۸) دس سالہ تعلیمی پروگرام مکمل کرنے کے بعد طالب علم پر صرف ایک مضمون کی ذمہ داری ڈالی جائے اور اس کا دورانیہ پانچ سال مقرر ہو۔ مثلاً" طب' قرآن' فقہ' صرف ونحو' ادب' منطق' کمسٹری وغیرہ۔ کیونکہ زیادہ مضامین اختیار کرنے کی وجہ سے طالب علم کسی مضمون کا بھی نہیں رہتا۔ تجربہ اس کا شاہد ہے۔ ہمارا ایم اے آٹھ نو مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا ایم اے کا طالب علم اپنے مضمون میں کماحقہ ماہر نہیں ہوتا۔ بی ایڈ میں آٹھ مضامین' جن کی اکثریت لایعنی ہے۔ ایم ایڈ میں رسماً" تو پانچ مضامین ہیں مگر عملاً دس ہیں۔ ریسرچ اور اسٹیٹکس کو ایک مضمون بنا دیا۔ فلسفہ اور نصاب ایک کر دیا۔ اسی طرح دوسرے مضامین۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ان تعلیمی اداروں سے نکلنے والے کسی مضمون پر بھی عبور نہیں رکھتے۔

(۱۹) چھٹی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک ٹیکنیکل (فنی) تعلیم کو بھی لازمی قرار دیا جائے۔ اس کے لیے ملک و قوم کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر طلباء کو فنی تعلیم دی جائے۔ پانچ سال کے اندر طالب علم کو کسی ایک فن کا ماہر بنا دیا جائے۔ اسی طرح جب یہ طلباء اپنی تعلیم سے فارغ ہونے لگیں تو ملازمت کے محتاج نہیں رہیں۔ اپنی روزی خود کما سکیں گے۔

(۲۰) تعلیم کے ساتھ معاش کو نہ جوڑا جائے اس طرح تعلیم کا مقصد فوت ہو جاتا ہے کیونکہ اسلامی تعلیم کا مقصد انسان کی سیرت وکردار کی تعمیر' اخلاقی بلندی' رضائے الٰہی اور آخرت کی تیاری ہے اس لیے تعلیم کے دوران ہی اس کا سد باب کیا جائے اور طلباء کو ٹیکنیکل تعلیم دی جائے۔ فنی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے آج ہماری تعلیم اپنی افادیت کھو چکی ہے۔ نو سال کے بعد اگر بچہ میٹرک میں فیل ہوتا ہے یا میٹرک نہیں کر پاتا تو اس کے نو' دس سال ضائع ہو گئے' وہ کسی کام کا نہیں رہا۔ اکثر بے روزگاری ہمارے انہی تعلیمی اداروں کی پیداوار ہے۔

(۲۱) اقلیتوں کے لیے جداگانہ اسکول قائم کیے جائیں' اگر کوئی مسلمانوں کے اسکول میں پڑھنا چاہے تو اس پر پابندی نہ ہو۔

(۲۲) تعلیم کا شوق دلانے کے لیے ہر قسم کی ملازمت کے لیے ناظرہ قرآن کو شرط قرار دیا جائے۔

(۲۳) ہر قسم کی سہولت دینے کے لیے مثلاً" پاسپورٹ' لائسنس پرمٹ وغیرہ ناظرہ قرآن کو شرط قرار دیا جائے تا کہ بالغ افراد کے اندر بھی تعلیم کا شوق پیدا ہو۔

(۲۴) نشرواشاعت کے تمام شعبوں کے ذریعے اسلامی نظام تعلیم کی خوبیوں کو بیان کیا جائے اور اس کی ترغیب دی جائے۔ نیز ان شعبوں پر خلاف شرع امور کی نشرواشاعت پر فوری پابندی عائد کی جائے۔ بلکہ ان شعبوں کو اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا جائے۔

(۲۵) چاروں صوبوں کے ادارہ نصابیات (بیورو آف کریکولم) میں ایک سینئر ماہر مضمون کی زیر سرپرستی اسلامیات کا ایک سیل قائم کی اجائے جس میں اسلامیات سے متعلق ماہرین مضمون ہوں۔ یہ سیل صوبے میں اسلامیات پر اساتذہ کو مختصر المیعاد تجدیدی کورس کرائے۔ اس میں سینئر ایس ایس کا ایم اے عربی ہونا یا وفاق المدارس کا آخری امتحانی (دورہ حدیث) پاس ہونا ضروری ہے۔ ایم ایڈ بھی ہو۔ ایلیمنٹری کالجوں میں کم از کم دو سالہ تدریس کا تجربہ بھی رکھتا ہو۔ بیورو کے تمام ایس ایس کو اس کا پابند کیا جائے کہ وہ اس سینئر ایس ایس

ے اسلامیات کے بارے میں استفادہ کریں۔

(۲۶) تمام اسکولوں کے اندر مساجد تعمیر کرائی جائیں اور تدریس کے دوران نماز کا وقفہ ہو۔

(۷) ادیب' عالم اور فاضل کے امتحانات کو ختم کر دیا جائے' ان کا کوئی فائدہ نہیں۔

نکتہ نمبر۵

جدید علوم تو بے شمار ہیں اگر ان کی تعیین کر دی جاتی تو شاید اس پر کچھ تبصرہ کرتے۔ دینی مدارس کا دورانیہ بظاہر تو آٹھ' دس سال کا ہے لیکن اگر اس کے کورس کو سرکاری مدارس کے طریقہ کار سے پڑھانے کی کوشش کی جائے تو شاید تیس سال میں بھی مکمل نہ ہو۔ اس لیے دینی مدارس مزید مضامین کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ البتہ وقت کی ضرورت کو سامنے رکھ کر ایک پیریڈ آگے پیچھے کر سکتے ہیں جو ایک گھنٹے کا ہوتا ہے' اس میں ریاضی' اردو اور انگریزی کو جگہ دی جا سکتی ہے۔ نیز جدید ٹیکنالوجی کے لیے طلباء اپنا تفریح کا وقت دے سکتے ہیں مثلاً" کمپیوٹر وغیرہ کی تعلیم۔

نکتہ نمبر۶

دینی مدارس اور سرکاری مدارس کے نصاب میں سو فیصد ہم آہنگی پیدا کرنا ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس کو ناممکن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے طلباء کا مزاج محنت ومشقت' صبر وتحمل اور سہر اللیالی کا ہے۔ ان کے سولہ سترہ گھنٹے روزانہ تعلیم وتعلم' بحث وتکرار اور مطالعہ میں گزرتے ہیں۔ ان کی یہ ساری محنت اساتذہ کی کڑی نگرانی میں ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کا یہ سلسلہ دس گیارہ سال تک جاری رہتا ہے۔ اگر دینی مدارس کے طلباء بھی روزانہ پانچ گھنٹے تعلیم کو دس سال جیسا کہ سرکاری مدارس کا حال ہے (بشرطیکہ سرکاری مدارس کا یہ سلسلہ سارا سال جاری رہے کوئی اسٹرائک وغیرہ نہ ہو) تو ہمارا نصاب تیس سال میں کہیں جا کر مکمل ہو۔

ہمارے سرکاری مدارس کے طلباء کو کوہ قاف کی پریوں کی طرح محنت ومشقت سے کوسوں دور نقل کی امید پر امتحان کا انتظار ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ہم آہنگی کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ البتہ جب حکومت اس جدید نظام تعلیم کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے میں کامیاب ہو جائے گی تو کچھ نہ کچھ ہم آہنگی خود بخود پیدا ہو جائے گی۔

(مولانا) سلیم اللہ خان

جامعہ فاروقیہ' شاہ فیصل کالونی' کراچی
صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مولانا زاہد الراشدی کا جواب

حکومت پاکستان کے قائم کردہ نیشنل ایجوکیشن کمیشن کی کمیٹی نمبر ۵ نے دینی مدارس اور مروجہ تعلیمی اداروں کے نصاب و نظام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے جو سوال نامہ جاری کیا ہے' اگرچہ اس میں چھ سوالات ہیں لیکن یہ سب سوالات بنیادی طور پر دو سوالوں پر مشتمل ہیں۔ ایک یہ کہ عصری سکولوں اور کالجوں کے نصاب ونظام کے ساتھ دینی مدارس کے نصاب ونظام کو کس طرح زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؟ اور دوسرا یہ کہ دینی مدارس کو درپیش مسائل و ضروریات میں حکومت کیا تعاون کر سکتی ہے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے' اس ضمن میں یہ گزارش ہے کہ اگرچہ یہ بظاہر ایک دل کش اور خوش نما تصور ہے لیکن اصولی طور پر یہ غلط اور غیر منطقی سوچ ہے کیونکہ اس سوچ کی بنیاد ان دونوں نظام ہائے تعلیم کی جداگانہ ضرورت واہمیت کو تسلیم کرنے پر ہے اور یہ ضرورت و اہمیت بجائے خود محل نظر ہے۔

عصری سکولوں اور کالجوں کا نظام تعلیم مستقل حیثیت کا حامل ہے اور دینی مدارس کا نظام تعلیم اس سے بالکل مختلف اور الگ حیثیت رکھتا ہے۔ ان دونوں کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اس دور کی قومی ضروریات کے پیش نظر ہوا تھا۔ دونوں تعلیمی نظاموں کی بنیاد خوف اور تحفظات پر تھی۔ جدید تعلیم کا نظام کھڑا کرنے والوں کے سامنے یہ خوف تھا کہ اگر مسلمانوں نے انگریزی تعلیم حاصل نہ کی تو وہ نئے قومی نظام میں شریک نہ ہو سکیں گے اور ان کے ہندو معاصرین اس دوڑ میں آگے بڑھ کر قومی زندگی پر تسلط جمالیں گے جس سے مسلمان دوسرے درجے کے شہری بن کر رہ جائیں گے جبکہ دینی تعلیمی نظام کے بانیوں کو یہ خوف لاحق تھا کہ اگر قرآن و سنت اور عربی علوم کی تعلیم کا اہتمام نہ کیا گیا تو مسلمانوں کا رشتہ اپنے مذہب و اعتقاد سے کٹ جائے گا اور وہ دینی تشخص سے محروم ہو جائیں گے۔ یہ دونوں خوف اپنی اپنی جگہ صحیح تھے اور انہی کی بنیاد پر دو الگ اور مستقل نظام ہائے تعلیم وجود میں آگئے لیکن قیام پاکستان کے بعد ان میں سے کسی خوف کے تسلسل کا کوئی جواز باقی نہیں رہ گیا تھا اور قومی دانش وروں کی ذمہ داری تھی کہ وہ ان خدشات کی نفی کرتے اور دونوں محاذوں پر قوم کو خوف سے نجات دلا کر خوف اور تحفظات کی بنیاد پر تشکیل

پانے والے دونوں تعلیمی نظاموں کے یکسر خاتمہ کی راہ ہموار کرتے لیکن بد قسمتی سے اب تک ایسا نہیں ہوا اور ہم حصول آزادی کے تقریباً نصف صدی بعد بھی تعلیمی پالیسیوں کے لحاظ سے ابھی تک انیسویں صدی کے اواخر کے ذہنی دائروں میں کوہلو کے بیل کی طرح چکر کاٹ رہے ہیں۔

کالجوں اور دینی مدارس کے نصاب و نظام میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہماری بنیادی تعلیمی ضرورت نہیں ہے۔ یہ محض ایڈ ہاک ازم ہے جو کسی ٹھوس اور واضح تعلیمی پالیسی کے جڑ پکڑنے تک ایک عبوری اور عارضی انتظام کا درجہ تو پا سکتی ہے لیکن یہ ہمارے تعلیمی مسائل کا حل نہیں ہے۔ اور اگر سنجیدگی کے ساتھ تجزیہ کیا جائے تو دونوں نصابوں کو مکمل طور پر ہم آہنگ کرنا قابل عمل اور ممکن بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر دونوں نصاب پورے کے پورے یکجا کر دیے جائیں تو طلباء کی میسر کھیپ میں سے شاید پانچ فی صد بمشکل اسے کور کر سکیں گے اور ایک کو بنیاد بنا کر دوسرے نصاب کی چند چیزیں اس کے ساتھ ایڈ جسٹ کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے تو اسے "ہم آہنگی" قرار دینا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے ہمارے نزدیک یہ تصور ہی سرے سے غلط ہے کہ دونوں نظام ہائے تعلیم کو یکجا کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ جرات و حوصلہ سے کام لے کر ان دونوں نظاموں کی نفی کرتے ہوئے ایک نئے نظام تعلیم کی بنیاد رکھی جائے۔ ان دو نظام ہائے تعلیم کی نفی کا مطلب ان کے قومی کردار کی نفی نہیں ہے۔ دونوں نے اپنے اپنے دائرہ میں قوم کی خدمت کی ہے اور ان میں سے کسی کے کردار کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی ضرورت و اہمیت کا دور گزر چکا ہے اور دونوں نظام اپنی طبعی عمر پوری کر چکے ہیں اس لیے انہیں مصنوعی تنفس کے ذریعہ زندہ رکھنے کی کوشش نہ عقل و دانش کا تقاضا ہے اور نہ ہی ایسا کرنا نئی نسل کے ساتھ انصاف کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوگا۔ ہمارے خیال میں قومی تعلیمی کمیشن کا اصل رول یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک نئے اور انقلابی نظام کے لیے قوم کی ذہن سازی کرے اور دونوں طبقوں کے ماہرین تعلیم کو اعتماد میں لے کر نئے تعلیمی نظام کا ڈھانچہ تشکیل دے۔

نئے تعلیمی نظام کو بنیادی شخصی ضروریات اور قومی تقاضوں کے دو دائروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک تعلیمی نظام کا پہلا حصہ بنیادی شخصی ضروریات پر مشتمل ہونا چاہیے اور دوسرے حصہ میں قومی ضروریات کو ایک حسین توازن و تناسب کے ساتھ سمو دینا چاہیے مثلاً اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ہر شہری کی بنیادی ضروریات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اس کی مادری اور علاقائی زبان پر اسے عبور ہو اور وہ اسے لکھنے پڑھنے پر قادر ہو۔
۲۔ قومی زبان اردو پر بھی اسے یہی قدرت حاصل ہو۔
۳۔ دینی زبان عربی کے ساتھ اس کا اتنا تعلق ضرور ہو کہ وہ قرآن و حدیث کو سمجھ سکے۔
۴۔ بین الاقوامی زبان انگریزی پر بھی اسے دسترس حاصل ہو۔
۵۔ عقائد' عبادات' اخلاق اور معاملات کے بارے میں اسے اتنا دینی علم حاصل ہو کہ وہ ایک صحیح مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کر سکے۔
۶۔ اتنا حساب کتاب جانتا ہو کہ روز مرہ کے معاملات میں اسے وقت پیش نہ آئے۔
۷۔ ملکی اور بین الاقوامی حالات سے اس قدر واقف ہو کہ قومی تقاضوں کو سمجھ سکے۔
۸۔ وہ جدید سائنسی علوم کے بارے میں بنیادی معلومات سے بہرہ ور ہو۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ ان بنیادی ضروریات پر مشتمل نصاب تعلیم کو میٹرک تک از سر نو مرتب کیا جائے اور اسے ہر شہری کے لیے "قانونا" لازمی قرار دے دیا جائے۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے کے تعلیمی نظام میں قومی تقاضوں کو سامنے رکھ کر شعبوں کی تقسیم کی جائے "مثلا" ہمیں اچھے علماء کی ضرورت ہے' بہترین سائنس دانوں کی ضرورت ہے' قابل ڈاکٹروں کی ضرورت ہے' ماہر انجینئروں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں ماہرین درکار ہیں' اس لیے میٹرک کے بعد ہر طالب علم کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنے ذوق اور صلاحیت کے مطابق ان میں سے کسی ایک شعبہ میں تعلیم و مہارت حاصل کرے اور قومی پالیسی کے طور پر ایک ایسا توازن قائم کیا جائے کہ تمام شعبہ ہائے زندگی کی ضروریات تناسب کے ساتھ پوری ہوتی رہیں۔

دوسرا اہم سوال دینی مدارس کی ضروریات و مسائل میں حکومت کے ممکنہ تعاون کی صورت کے بارے میں ہے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ دینی مدارس معاشرہ میں قرآن و سنت اور دیگر دینی علوم کی ترویج اور بقا و تحفظ کا جو کردار ادا کر رہے ہیں' وہ بہت بڑی قومی خدمت ہے اور جب تک دینی تعلیم کی تمام ضروریات کو اپنے اندر سمو لینے والا کوئی ہمہ گیر نظام تعلیم وجود میں آکر مستحکم نہیں ہو جاتا' اس وقت تک دینی مدارس کی ضروریات اور ان کا کردار بہرحال ایک ناگزیر قومی تقاضے کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ دینی مدارس کا یہ کردار ان کے آزادانہ نظام کی بدولت ہی تاریخ میں اپنی جگہ بنا سکا ہے جو ہر دور میں حکومت کی سرپرستی اور دخل اندازی سے بے نیاز رہا ہے۔ اگر دینی مدارس کو وقت کی حکومتوں کی دخل اندازی سے آزادی اور بے نیازی حاصل نہ ہوتی تو ان کی خدمات اور

جدوجہد کے نتائج کی موجودہ شکل سامنے نہیں آسکتی تھی۔ اس لیے ہمارے نزدیک دینی مدارس کا سب سے بڑا مسئلہ اور ان کی سب سے اہم ضرورت ان کا آزادانہ تعلیمی کردار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو دینی ادارے اپنے معاشرتی کردار کی اہمیت سے شعوری طور پر آگاہ ہیں' وہ ہر دور میں سرکاری امداد قبول کرنے سے گریزاں رہے ہیں اور آج بھی بے نیازی کی اسی روش پر گامزن ہیں۔ محتاط دینی اداروں کی سوچ یہ ہے کہ پاکستان میں قائم ہونے والی حکومتوں کا اسلام کے ساتھ تعلق مخلصانہ اور نظریاتی نہیں بلکہ مصلحت پرستانہ ہے اور وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ کسی بھی قسم کی سرکاری امداد حکومت کی پالیسیوں اور مصلحتوں کے ساتھ کسی نہ کسی درجہ میں وابستگی کا احساس ضرور پیدا کر دیتی ہے۔ پھر بعض تجربات نے اس احساس کو بھی جنم دیا ہے کہ حکومت کی سرپرستی میں آنے کے بعد دینی مدارس شاید اپنے موجودہ کردار کو برقرار نہیں رکھ سکیں گے جیسا کہ محکمہ تعلیم کی تحویل میں آنے والے جامعہ عباسیہ بہاولپور اور محکمہ اوقاف کے کنٹرول میں آنے والے جامعہ عثمانیہ اوکاڑہ کے انجام سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے اگر حکومت دینی مدارس کو ان کے آزادانہ کردار کے تحفظ کا یقین اور اعتماد دلا سکے تو یہ ان مدارس کے ساتھ حکومت کا سب سے بڑا تعاون ہوگا اور پھر آزادانہ کردار کے تحفظ کے ساتھ دینی مدارس کے اخراجات میں ان سے تعاون' ان کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے میں ماہرین کے ذریعہ ان کی راہنمائی' ان کی سندات کی مسلمہ حیثیت کو یقینی اور قابل عمل بنانے اور ان کے درمیان رابطہ و تعاون کی فضا کو بہتر بنانے کے اقدامات کے ذریعہ حکومت دینی مدارس کی بہتر خدمت کر سکتی ہے۔

جدید نصاب تعلیم معارف اسلامی کی شاہکار کتب

معارفی قاعدہ ○ معارفی نماز

معارفی دینیات ○ معارف الایمان

معارف الاسلام ○ معارف التجوید

ناشر: ندوۃ المعارف' مرکزی جامع مسجد' گکھڑ' ضلع گوجرانوالہ

درس نظامی کا سرکاری نصاب

محکمہ تعلیم حکومت پاکستان نے سرکاری سکولوں اور کالجوں کے لیے "درس نظامی" کا نصاب ترتیب دے کر "درس نظامی گروپ" کے نام سے اس کی تعلیم کا اعلان کیا ہے۔ اس کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن، گوجرانوالہ

نمبر ۹۴۲ اکیڈمک
مورخہ ۷ جولائی ۱۹۹۷ء

نوٹیفکیشن

جملہ متعلقین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ حکومت پاکستان، وزارت تعلیم کریکلم ونگ، اسلام آباد نے اپنے مراسلہ نمبر F.I. -3/93 -I.E II مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۹۷ء کے تحت میٹرک/انٹرمیڈیٹ سطح پر "درس نظامی گروپ" متعارف کرواتے ہوئے اس کا امتحان مروجہ قواعد وضوابط کے مطابق بورڈ کے زیر اہتمام کروانے کی منظوری دی ہے۔

مذکورہ گروپ میں تمام سکولوں/کالجوں کے علاوہ دینی مدارس کے طلباء/طالبات بھی بطور امیدوار شریک امتحان ہو سکیں گے۔ تاہم ایسے دینی مدارس جن میں "درس نظامی گروپ" کی کلاسیں جاری ہیں اور یہ مدارس بورڈ سے ملحق نہ ہیں، ان کا قوانین کے مطابق بورڈ سے الحاق کروا لیا جائے۔ متذکرہ گروپ کا اطلاق ۹۸-۱۹۹۷ء سے ہوگا۔ سلیبس ارسال ہے۔

پروفیسر مرزا عنایت اللہ

نصاب درس نظامی گروپ برائے میٹرک (کل نمبر ۸۵۰)

حصہ اول (نمبر ۴۵۰)

۱۔ انگریزی	۱۰۰
۲۔ اردو	۷۵

۳۔ مطالعہ پاکستان ۷۵

۴۔ جنرل سائنس ۱۰۰

۵۔ ریاضی ۱۰۰

کل نمبر ۴۵۰

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کی تیار کردہ کتب برائے میٹرک نافذ العمل ہوں گی۔

حصہ دوم (نمبر ۴۰۰)

۱۔ ترجمہ قرآن مجید از سورۃ الفاتحہ تا اختتام سورۃ النساء ۱۰۰ نمبر

(شروع سے پانچ پارے) قرآن مجید کا صرف آسان ترجمہ شامل ہوگا

۲۔ حدیث و سیرت ۱۰۰ نمبر

(الف) حدیث (۵۰ نمبر)

عنوانات:

i) الادب

ii) البر والصلہ

iii) الزہد والورع

iv) الترہیب من مساوی الاخلاق (رذائل اخلاق)

v) الترغیب فی مکارم الاخلاق (فضائل اخلاق)

vi) الذکر والدعاء

کتب:

i) زاد الطالبین اور ریاض الصالحین سے مذکورہ ابواب

ii) بلوغ المرام (کتاب الجامع)

iii) اربعین حدیث

(ب) سیرت (۵۰ نمبر)

عنوانات:

i) ولادت وخاندان

ii) آپ کا بچپن (حیات طیبہ نزول وحی سے قبل)

iii) نزول وحی کے بعد مکی زندگی، ہجرت حبشہ، سفر طائف، واقعہ معراج

(سورہ اسراء اور سورۃ النجم کی متعلقہ آیات کے حوالے سے)، ہجرت

iv) مدنی زندگی ۔ میثاق مدینہ، مواخات، غزوات، صلح حدیبیہ وفتح مکہ، تبلیغ، شاہان وقت کے نام خطوط، سفارتی و تبلیغی مہمات

v) اوصاف واخلاق نبوی اور معجزات، ازواج واولاد

vi) خطبہ حجۃ الوداع، وفات

کتب : رحمت عالم از سید سلیمان ندوی

۳۔ قواعد عربیہ (صرف ونحو) (۱۰۰ نمبر)

عنوانات :

i) اسم الاشارۃ (القریب والبعید)

ii) المرکب الاضافی (المضاف والمضاف الیہ)

iii) المرکب التوصیفی (النعت والمنعوت)

iv) الحروف الجارۃ

v) ان واخواتھا ۔ کان واخواتھا ۔ نواسخ الجملۃ

vi) اسم الفاعل واسم المفعول

vii) اسم التفضیل

viii) الفعل الماضی المعروف

ix) الفعل المضارع المعروف

x) الفعل الماضی المجھول

xi) الفعل المضارع المجھول

xii) ابواب الثلاثی المجردۃ

xiii) ابواب الثلاثی المزید فیھا

xiv) الحروف الناصبۃ للمضارع

xv) الحروف الجازمۃ للمضارع

xvi) افعال المقاربۃ

xvii) افعال المدح والذم

xviii) ہفت اقسام

کتب:

i) النحو الواضح (الاجزاء الثلاثۃ الاولیٰ)

ii) میزان الصرف

iii) علم الصیغہ

iv) شرح ماۃ عامل

v) ہدایۃ النحو

vi) اساس عربی

۳۔ فقہ (۱۰۰ نمبر)

عنوانات:

i) کتاب الطہارہ

ii) کتاب الصلوٰۃ

iii) کتاب الزکوٰۃ

iv) کتاب الصوم

v) کتاب الحج

کتب:

i) القدوری

ii) الروضۃ الندیہ (الجزء الاول)

iii) تبصرۃ العلوم

نصاب درس نظامی گروپ برائے انٹر میڈیٹ (کل نمبر ۱۱۰۰)

حصہ اول (نمبر ۲۵۰)

۱۔ انگریزی	۱۰۰ نمبر
۲۔ اردو	۱۰۰ نمبر
۳۔ مطالعہ پاکستان	۵۰ نمبر
کل نمبر	۲۵۰

کتب : علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کی تیار کردہ درسی کتب شامل نصاب ہوں گی۔

حصہ دوم (نمبر ۸۵۰)

۱۔ ترجمہ قرآن مجید مع تفسیر ۱۵۰

از سورۃ المائدہ تا اختتام سورۃ الکہف (دس پارے تقریبا)

آسان ترجمہ مختصر تفسیر کے ساتھ

۲۔حدیث مع اصول حدیث (۱۰۰ نمبر)

(الف) حدیث

(۱) کتاب الایمان تا کتاب العلم یعنی :

کتاب الایمان

کتاب العلم

کتاب الجنائز

کتاب الرقاق

(۲) باب الکبائر وعلامات النفاق

الوسوسہ' الایمان بالقدر' اثبات عذاب القبر' الاعتصام بالکتاب والسنہ' کتاب العلم

(۳) کتاب الجنائز مکمل

عیادۃ المریض وثواب المرض' تمنی الموت وذکرہ' ما یقال عند من حضرہ الموت' غسل المیت وتکفینہ' المشی بالجنازۃ والصلوۃ علیہا' دفن المیت' البکاء علی المیت' زیارۃ القبور

(۴) کتاب الرقاق مکمل

فضل الفقراء' الامل والحرص' استحباب المال' التوکل والبصر'
الریاء والسمعۃ' البکاء والخوف' کف الناس' الانذار والتحذیر

کتاب: مشکوٰۃ شریف

(ب) اصول حدیث

i) مقدمہ مشکوٰۃ

ii) اصطلاحات المحدثین

iii) درایہ فی الحدیث

iv) اصول کافی جلد اول

۳۔ فقہ (۱۰۰ نمبر)

i) کتاب النکاح

ii) کتاب الطلاق

iii) کتاب البیوع

iv) کتاب الذبائح

v) کتاب الاضحیہ

کتب متعلقہ ابواب

i) کنز الدقائق

ii) الروضہ الندیہ

iii) شرائع الاسلام

۴۔ اصول فقہ

کتب:

i) اصول الشاشی

ii) اصول فقہ۔ عاصم الحداد

iii) مبادی الاصول

۵۔ قواعد عربیہ (صرف ونحو)

ابتدائی اصطلاحات

i) مرفوعات

ii) منصوبات

iii) مجرورات

iv) علیلات

v) خصائص الابواب

کتب:

i) فصول اکبری

ii) کافیہ

۶۔ عربی ادب

کتاب: حدیقہ الادب مکمل

۷۔ منطق

کتاب: مرقاۃ

۸۔ تاریخ اسلام

خلافت راشدہ

کتب:

i) تاریخ الخلفاء ۔ علامہ سیوطیؒ۔

ii) احسن القال جلد دوم ۔ منظور حسین نجفی

iii) تاریخ اسلام ۔ معین الدین ندوی

iv) ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ ۔ ثروت صولت

نوٹ: کتب کی تدریس بالخصوص فقہ وحدیث کے سلسلے میں ہر مکتبہ فکر کی منظور شدہ کتب شامل نصاب کی گئیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی

نئی قومی تعلیمی پالیسی پر ایک نظر

سب سے پہلے میں وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف اور ان کی حکومت کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار انہوں نے آئینی تقاضے پورے کرتے ہوئے اسلامک ایجوکیشن کو قومی تعلیمی پالیسی میں اس کا مناسب مقام دینے کے لیے پیش رفت کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم جو ہماری رہنمائی کے لیے نازل ہونے والی آخری اور مکمل الہامی کتاب ہے، اسے پچھلے پچاس سالوں میں کبھی بھی عملی طور پر رہنما کتاب کی حیثیت نہیں دی گئی۔ پہلی بار یہ شعوری اور مخلصانہ کوشش کی گئی ہے کہ ہر طالب علم کو براہ راست قرآن سے وابستہ کر دیا جائے جس کے لیے جناب وزیر اعظم کی ذاتی دلچسپی سب سے بڑا محرک ہے۔

اسلامک ایجوکیشن کے سلسلے میں پالیسی کے دو حصے ہیں:

۱۔ قرآن حکیم ناظرہ وبا ترجمہ کی تدریس

۲۔ دینی مدارس کے نظام اور نصاب میں بہتری کی کوشش

مذکورہ بالا دونوں کوششیں انتہائی قابل تحسین ہیں لیکن میں اختصار کے پیش نظر ان کی تمام خوبیوں کا اجمالی اعتراف کرتے ہوئے بعض ایسی چیزوں کی طرف توجہ مبذول کراؤں گا جن میں مزید بہتری پیدا کر کے موثر نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ پہلے ناظرہ قرآن کی تدریس کی بات کرتے ہیں۔

۱۔ اس ساری اسکیم میں مساجد سے استفادہ، والدین اور معاشرے کی قرآن کی تعلیم میں شمولیت، ائمہ اور اساتذہ مساجد کی تربیت کا کہیں تذکرہ نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں مسجد کی شکل میں عمارت، فرنیچر، استاذ، والدین اور بچوں کی تدریس قرآنی سے دلچسپی کا بے پناہ اثاثہ موجود ہے۔ اس کے لیے اگر ہم ائمہ اور اساتذہ مساجد کی تربیت کا کوئی انتظام کر سکیں تو ایک طرف ہم اپنی نئی نسل کو مسجد سے وابستہ رکھ سکیں گے اور دوسری طرف قومی وسائل پر مزید بوجھ ڈالنے کے بجائے والدین اور کمیونٹی کو تدریس قرآن اور تربیت اولاد کے عمل میں شریک کر سکیں گے۔

۲- جہاں تک قرآن حکیم باترجمہ پڑھانے کا تعلق ہے تو اس پالیسی کو جس طرح نافذ کیا جا رہا ہے' مجھے یہ کہنے دیجئے کہ اگر اس کے پیچھے کوئی سازش کار فرما نہیں تو اس آخری حد کی نادانی ہے جس کے نتیجے میں مجھے اندیشہ ہے کہ بچوں میں قرآن سے نفرت پیدا ہونے کے علاوہ شاید ہی کوئی نتیجہ برآمد ہو سکے۔ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم طلبہ کو ترجمہ رٹانے کے بجائے ان میں قرآن فہمی کی استعداد پیدا کریں۔ اگر ہم محض ترجمہ رٹا کر زبان جانے بغیر شکسپیر نہیں پڑھا سکتے تو ہم نے تدریس قرآن کے لیے ترجمہ رٹانے کا طریقہ کیوں اختیار کیا ہے؟ کیا ترجمہ رٹ لینے سے کوئی استعداد پیدا ہوگی؟ ہمارے ملک میں قرآن فہمی کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے متعدد کامیاب تجربات ہوئے ہیں۔ پاکستان کے ایک مایہ ناز فرزند اور عربی کے سکالر ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ زمان نے ٹی وی پر قرآنی عربی پڑھائی جس سے ترجمہ قرآن کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ حکوم کو وزارت تعلیم کے کریکولم ونگ کی تنگنائے سے باہر نکل کر ماہرین کی خدمات حاصل کرنی چاہئیں۔ اس ضمن میں' میں اپنے ادارے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی خدمات پیش کرتا ہوں۔ اگر حکومت چاہے تو ہمارا ادارہ ملک بھر کے ماہرین سے استفادہ کر کے نہ صرف قرآن فہمی کے لیے ایک ایسا پیکج تیار کر کے دینا اپنی سعادت سمجھے گا جو ہر طالب علم میں قرآن کا سادہ ترجمہ سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنے کا ضامن ہوگا بلکہ اس پروگرام کے لیے جس قدر اساتذہ کی تربیت درکار ہوگی' ہم اس کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ ہماری پالیسی یہ کہتی ہے کہ چھٹی جماعت سے آٹھویں تک will be maintained The stuatus-quo ۔ اور اس کے نتائج آپ کے سامنے ہیں۔

۳- دینی مدارس کو Main-stream میں لانے کے لیے جو اقدامات تجویز کیے گئے ہیں' وہ بہت مناسب ہیں البتہ اب تک کا تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ دینی مدارس نے کسی حکومت پر اعتماد نہیں کیا کیونکہ انہیں اس بات کا خطرہ ہے کہ حکومت ان کے داخلی نظم میں مداخلت کرے گی۔ نتیجتاً" مدارس کا سارا نیٹ ورک متاثر ہوگا۔ پچھلے پچاس سال میں متعدد کوششیں کی گئیں جو ثمر آور نہیں ہوئیں۔ اس کے لیے درحقیقت ایسی اسکیم کی ضرورت تھی جو مدارس کے داخلی نظم اور ان کے معیار تعلیم میں' جو بالعموم خاصا بلند ہے' کسی قسم کی مداخلت کے بغیر ان کے لیے تکمیلی تعلیم Complementary Education کی سہولت بہم پہنچائے اور سرٹیفکیشن کی جا سکے۔ چنانچہ دینی مدارس کے مختلف وفاقوں اور ارباب حل وعقد کے ساتھ طویل مشاورت کے بعد علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے گزشتہ سال سے درس نظام

پروگرام کا اجرا کر دیا ہے جس کا بنیادی ڈھانچہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ اپنے اداروں میں تعلیم جاری رکھتے ہوئے یونیورسٹی میں Enroll ہو جاتے ہیں۔ یونیورسٹی درس نظامی کے لازمی کورسز کا امتحان لے لیتی ہے اور انہیں کریڈٹ دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر طالب علم یونیورسٹی کے کورسز مثلاً" ریاضی، سائنس، اردو، انگریزی، معاشیات، سیاسیات وغیرہ میں سے ہر سمسٹر میں ایک ایک لے کر دو سال میں چار کورسز مکمل کر لیتا ہے۔ یونیورسٹی اپنے فاصلاتی نظام تدریس کے مطابق انہیں ٹیوٹرز اور دیگر سہولتیں فراہم کرتی ہے اور یوں وہ درس نظامی کے ساتھ میٹرک، ایف۔ اے اور بی۔ اے کر لیتے ہیں۔ اس پروگرام کا میٹرک سے بی۔ اے تک آغاز ہو چکا ہے اور پہلے دو سمسٹرز میں ہمارے پاس درس نظامی کے ڈیڑھ ہزار طلبہ داخلہ لے چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اس سال مئی سے ہم دینی مدارس کے فضلاء کے لیے دو مزید پروگرام شروع کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اگلے پانچ سال میں تمام دینی مدارس اس اسکیم میں شامل ہو جائیں گے کیونکہ اس سے ان کی آزادی، خود مختاری اور معیار کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

اتنا بڑا کام جو وفاقی وزارت تعلیم کے پڑوس میں ہو رہا ہے، حیرت ہے کہ قومی تعلیمی پالیسی میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔

۴۔ پالیسی میں ماڈل دار العلوم قائم کرنے کی تجویز بہت مناسب ہے لیکن اس کے لیے جگہ کا انتخاب مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ Co-Education کے اداروں کے پہلو میں ماڈل دار العلوم کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اس کے لیے ہم نے اپنی تجویز میں مناسب جگہوں کی نشاندہی کی تھی مثلاً" لاہور میں بادشاہی مسجد، پشاور میں مسجد مہابت خان اور دوسری اس طرح کی جگہیں جو اوقاف کے زیر انتظام ہیں اور وہاں عمارتیں موجود ہیں۔

آخر میں میری درخواست ہے کہ پالیسی کے نفاذ میں عجلت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اس پر وزارت تعلیم سے باہر کے ماہرین تعلیم کی آراء سے بھی استفادہ کیا جائے۔

محترم حکیم محمد سعید صاحب کا مکتوب گرامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدیر محترم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"الشریعہ" (جلد ۹ شمارہ ۲، مورخہ اپریل ۱۹۹۸ء) میں نے بہ امعان نظر دیکھا ہے۔ آپ نے یقیناً اس میں رہنما اور حقائق نما مضامین یکجا کر دیے ہیں۔

کلمہ حق میں آپ نے بعض امور کے باب میں بلیغ اشارات کیے ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ سیاست و قیادت نیز صحافت و امامت ان میں سے کوئی تیار نہیں ہے کہ وہ امہ مسلمہ پاکستانیہ کو حقائق سے آگاہ کرے۔ نہ صرف حالات حاضرہ کی سنگینی کا اظہار کرے بلکہ پاکستان اور اہل پاکستان کے ساتھ کل جو ہونے والا ہے، اس سے آگاہی بخشے۔ یہ سب کے سب اس موضوع میں مجتمع ہیں کہ ملت کو غافل رکھا جائے کہ مستقبل قریب میں لادینیت، یہودیت، عیسائیت اور قادیانیت کے مشترکہ حملے ہوں گے تو پوری قوم حیران اور بے بس نظر آئے۔

یہ ایک بدترین کوتاہی ہے بلکہ گناہ کبیرہ ہے کہ حقائق کا، جنہیں وہ جانتے ہیں، ان کا اخفا کیا جائے۔ خلیج میں، اور اس سے قبل مراکش، تونس، الجزائر اور مصر میں اسلام اور مسلمین کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے، وہ سامان عبرت ہے۔ ان مقامات پر مسلمان کے گلے میں پھانسی کے پھندے لگائے جا چکے ہیں اور پیروں میں آہنی زنجیرہائے اسیری ڈال دی گئی ہیں۔

غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ اس سب کے باوجود اتحاد بین المسلمین کی ایک آواز اب تک بلند نہیں ہوتی۔ ایک مسلمان ملک دوسرے کے سامنے آج بھی صف آرا ہے۔

ان حالات میں صرف اور صرف پاکستان ایک نہایت موثر کردار ادا کر سکتا ہے، مگر پاکستان میں اسلام اس مولوی کا عنوان زیست ہے کہ جس کا ایک ہاتھ محراب پر عالم حق کے نرخرے پر ہے اور دوسرا ہاتھ منبر پر "خطاب کفر" پر ہے۔

علمائے حق کی خاموشی پاکستان کے لیے شدید نقصان سے عبارت ہے۔ ان کی بیداری اشد ضروری ہے۔

بہ احترامات فراواں

آپ کا مخلص، حکیم محمد سعید

الشریعہ اکیڈمی مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ پاکستان

گزشتہ دس برس سے علمی و فکری محاذ پر اسلامی نظام کے تعارف و توضیح، اسلام دشمن لابیوں کی نشاندہی اور تعاقب اور علماء کرام اور دینی کارکنوں کی بریفنگ اور ذہنی و فکری تربیت کے لیے مسلسل سرگرم عمل ہے اور اس مقصد کے لیے مختلف موضوعات پر تربیتی اجتماعات کے اہتمام اور لٹریچر کی اشاعت و تقسیم کے علاوہ علمی و فکری مجلہ

سہ ماہی الشریعہ گوجرانوالہ

کی باقاعدگی کے ساتھ اشاعت کی ذمہ داری نباہ رہی ہے جس کی جولائی ۹۸ء کی اشاعت

دینی مدارس کا نصاب تعلیم اور دور حاضر کی ضروریات

کے عنوان پر ممتاز اصحاب علم و دانش کی منتخب نگارشات پر مشتمل ہے جبکہ اکتوبر ۹۸ء کا شمارہ

امریکہ اور پاکستان کے پچاس سالہ تعلقات کا جائزہ

کے عنوان پر منتخب مضامین پر مشتمل ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اور اس کے ساتھ ہی انٹرنیٹ پر دنیا بھر کے احباب کو "الشریعہ" اور دیگر ضروری دینی لٹریچر کی فراہمی کے انتظامات آخری مراحل میں ہیں۔

اس دور میں علمی و فکری تربیت اور ذہن سازی کا کام جس قدر ضروری ہے اسی قدر عدم توجہ کا شکار اور وسائل کا محتاج ہے۔ اس لیے الشریعہ اکیڈمی تمام احباب سے خصوصی توجہات، مخلصانہ دعاؤں اور مفید تجاویز اور مشوروں کے ساتھ بھرپور عملی اور مالی تعاون کی بھی خواستگار ہے تاکہ اس علمی جدوجہد کو موثر طریقہ کے ساتھ آگے بڑھایا جا سکے۔

رابطہ کے لیے: حافظ محمد عمار خان ناصر
ڈائریکٹر الشریعہ اکیڈمی، مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ
فون و فیکس ۲۱۹۶۶۳ (۰۴۳۱) ۔ ای میل : afayaz paknet1.ptc.pk

جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے کہ عربی اور اسلامی علوم کی تعلیم جس ڈھنگ پر دی جا رہی ہے، اس کی اصلاح ہو، اس کے بارے میں اہم اور بنیادی چیزیں کہی گئی ہیں۔ وہ چیزیں سرسری طور پر ہمارے سامنے ہیں۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ۔ اور اس کے بعد ہم کو موقع ملے گا کہ ہم غور کر سکیں کہ کیا واقعی ان اصلاحوں کی ضرورت ہے؟ کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ جو حضرات مسلمانوں کی تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں، اسلامی علوم کی تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں، وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں؟ ان کی ذمہ داریاں بہت ہیں۔ وہ نہ صرف ملک کے سامنے، بلکہ تمام عالم اسلام کے آگے جوابدہ ہیں۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور اس عظیم الشان خدمت کو انجام دیں؟ اس خواب کو جو سو برس سے لوگوں نے دیکھا ہے، اور جو آج تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا ہے، کم از کم آج تو اس کی تعبیر عالم اسلامی کے سامنے آئے۔ اس سلسلے میں اس پر غور کرنا چاہیے کہ جو طریقے اصلاح کے ہیں، ان کی اہم باتیں کیا ہیں اور مہمات کیا ہیں؟ سب سے پہلی چیز مختصراً" میں آپ سے کہوں گا کہ وہ فنون آلیہ کے متعلق ہے۔ میں نے فنون آلیہ کے متعلق آپ سے کہا۔ وہ فن خود مقصود نہ ہو، بلکہ وسیلہ ہو کچھ ایسی چیزوں کا جو مقصود ہوں، تو اس لیے وہ بھی ضروری ہو گئے۔ کچھ چیزیں تو بطور وسیلے کے ہیں اور کچھ چیزیں بطور مقصود کے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی غلطی نہیں ہو سکتی علم ونظر کے صیغے میں کہ ہم وسیلے کو مقصد بنا دیں۔ بد قسمتی یہ ہے کہ ہر گوشے میں سب سے پہلی ٹھوکر جو انسانی دماغ لیتا ہے، وہ یہ ہے کہ جس چیز کو اس نے بطور وسیلے کے پکڑا تھا، اس نے اسے مقصود بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم وحقیقت کے ہر صیغے میں ہم مقصد سے اتنا دور جا پڑے ہیں کہ ہم کسی حالت میں بھی اس کے نزدیک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ یہاں دیکھنا یہ ہے کہ کون سی چیز وسیلہ ہے، اور کون سی چیز مقصود ہے، تب ہم نے شیرازے کو درہم برہم کر دیا۔

(مولانا ابو الکلام آزاد۔ "خطبات آزاد" ص ۳۱۸)

REGD. L. NO. 8736

Third-Monthly
AL-SHARIA
Gujranwala, Pakistan.

E-Mail afayaz@ paknet1.ptc.pk

ورلڈ اسلامک فورم اور دعوہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے تعاون سے

مغربی ممالک میں مقیم مسلمان طلبہ اور طالبات کے لیے اسلامی تعلیمات کا انگلش اور اردو میں دو سالہ معیاری خط وکتابت کورس

اسلامک ہوم اسٹڈی کورس

جامعہ الہدیٰ نوٹنگھم (برطانیہ) کے زیر انتظام کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے جس میں اس سال مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے اڑھائی ہزار سے زائد طلبہ اور طالبات کورس مکمل کر رہے ہیں اور ستمبر ۹۸ء سے نئے دو سالہ کورس کا آغاز ہو رہا ہے' ان شاء اللہ تعالیٰ

نیز جامعہ الہدیٰ نوٹنگھم میں طالبات کے لیے اقامتی درسگاہوں کا معیاری انتظام موجود ہے جس میں سکول کی مروجہ سرکاری تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی زبان' قرآن کریم' حدیث نبویؐ' فقہ اسلامی اور اسلامی تاریخ کے ضروری مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں اور خالصتاً" دینی اقامتی ماحول مہیا کیا جاتا ہے۔

مزید معلومات کے لیے رابطہ کریں:

(مولانا) رضاء الحق سیاکھوی - پرنسپل

JAMIA AL-HUDDA

FORREST HOUSE, BERKLEY AVENUE, MPPERLEY PARK,

NOTTINGHAM MG35 AF (U.K.)

TEL. (0115) 969 2566 - FAX. (0115) 985 8997